چغتائی

کاجل

ہند پبلشرز لمیٹڈ لاہور

کاجل

چغتائی

عبدالرحمٰن

ہند پبلشرز لمیٹڈ۔ نسبت روڈ لاہور

پبلشرز:- پروفیسر موہن سنگھ پنج دریا پبلشرز لاہور
پرنٹرز:- پروفیسر موہن سنگھ مرکنٹائل پریس لاہور

قیمت
دو روپے بارہ آنے

ان کے نام

ایک وہ جس نے ہمیشہ میرے لکھنے کی مخالفت کی
ایک وہ جس نے ہمیشہ میرے لکھنے کی حمایت کی

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

عبدالرحیم اصغر چغتائی

"عبدالرحمن چغتائی"

لاہور

فہرس

"پہلے پہل"

میرے آخری افسانے سے شاید وہ سرگرمی نہ پائی جاتی ہو جو پہلا افسانہ لکھتے وقت مجھ میں تھی۔ یہ ممکن ہے۔ میرا پہلا افسانہ بالکل خام ہو جیساکہ ایک افسانے کے لئے ہونا ضروری ہے۔ مگر مجھے میرا پہلا افسانہ ایسا ہی عزیز ہے جیساکہ آخری۔ افسانہ لکھنے کا مجھے دعویٰ ہے اور نہ اپنی شکست کا اعتراف۔ اگر میرے افسانوں کے اِس مجموعہ میں ناامیدی کے ساتھ ساتھ اُمید کی کوئی جھلک دکھائی دے۔ اور میری ذہنی کشمکش کا پتہ چلے۔ تو اسے نظر انداز کرنا اقتضائے فکر کے منافی ہوگا۔ کیونکہ تخلیق کا دارومدار بنیادی تنفر ہی تو ہے۔

وہ ساعت بھی عجیب تھی۔ جب میں نے پہلا افسانہ لکھا تھا کیونکہ ہزار کوشش کے باوجود بھی اس سلسلے کو آج تک منقطع نہیں کر سکا۔ پہلے پہل افسانہ پڑھنے والوں کو مجھ سے توقعات تھیں۔ اور نہ مجھے اس کا احساس تھا کہ کوئی میرے افسانے پڑھے اور مجھے داد دے۔ وہ افتاد جو میرے افسانوں میں نظر آتی ہے وقت اور ذہنی کشمکش کی پیداوار ہے زندگی کی تلخ حقیقتوں اور انتہائی خوشیوں کے تاثرات ہی کا سبب ہے کہ آج میرے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہو رہے ہیں۔ ایک کا نام "کاجل" اور دوسرے کا نام "لگان" ہے یہ تمام افسانے جس ترتیب سے شائع ہوئے ہیں۔ تقریباً اسی ترتیب سے لکھے گئے ہیں۔

سب سے پہلا افسانہ میں نے ۱۹۱۴ء میں لکھا تھا۔ اور آج ۱۹۴۱ء تک برابر لکھتا چلا آ رہا ہوں۔ لگان اور کاجل میں ایک بنیادی تفاوت ہے۔ اسی طرح یہ تفاوت میرے آرٹ میں بھی موجود ہے۔ میرے آرٹ پر بھی مختلف دور آتے رہے ہیں۔ اور اس میں بڑی اہم تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ اور شاید میرا آرٹ سمجھنے والوں اور افسانے پڑھنے والوں کے لئے یہ سمجھنا آسان ہو۔ کہ میں نے اپنے آرٹ اور ادب کے لئے ایک ماحول پیدا کرنے میں کتنی جد و جہد کی ہے۔ میں فن برائے زندگی کا حامی ہوں۔ لیکن فن برائے فن کا منکر بھی نہیں۔ کیونکہ فن کا مفہوم ہمیشہ ہی سے انفرادیت اور افراد کی تشکیل رہا ہے۔ زندگی کا

مقصد ہے۔ کہ وہ آزادی کے ساتھ پھلے پھولے اور آرٹ کا صرف ایک ہی مقصد ہے۔ کہ وہ پھلتی پھولتی زندگی کا ساتھ دے۔ اور ان کیفیات کی ترجمانی کرتا رہے۔ جن میں انسان کی اپنی نجات ہے۔ بعض کا یقین ہے۔ کہ تصویر بنانے سے افسانہ لکھنا کہیں مشکل ہے۔ یعنی تصویریں آسانی سے بن جاتی ہیں۔ اور افسانہ اگر کوئی لکھ سکتا ہے۔ تو وہ صرف بیسویں صدی کا ترقی پسند پیغمبر۔ میں اس نظریے کا قائل ہوں یا نہیں لیکن افسانہ لکھ لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں سمجھتا۔ کیونکہ تصویریں بنانا جو میرے خیال میں افسانہ لکھنے سے زیادہ مشکل ہیں۔ بنا لیتا ہوں۔ اور افسانہ بھی لکھ لیتا ہوں میری دلی خواہش تھی۔ کہ میرے افسانے میرے نہ کہلائیں۔ مگر بعض وجوہات کی بنا پر میں اس ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اور وہ تمام فرضی نام فرضی ہو کر رہ گئے۔ جن مختلف ناموں پر میں وقتاً فوقتاً لکھتا رہا ہوں۔ اور آج مجھے لکھنا پڑتا ہے۔ وہ افسانے پہلے بھی میرے تھے۔ اور آج بھی میرے ہیں۔ میرے اس تجربے نے ایک ایسی پُر لطف کیفیت پیدا کر دی تھی۔ جس کا مجھے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ جب افسانہ گاڑیبان ۱۹۳۴ء کے کاروان میں ناگامیاں کے نام سے شائع ہوا۔ تو میرے ایک عزیز ترین دوست نے اپنی میز پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ یہ افسانہ سو فیصدی ترجمہ ہے۔ ہو سکتا ہے۔ اسے ہندوستانی ماحول

میں ڈھال لیا گیا ہو۔ مگر یہ کبھی باور نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ہم میں سے اس ٹیکنیک پر کوئی ایسا طبع زاد افسانہ تخلیق کر سکتا ہے۔ بہ صورت دیگر یہ افسانہ طبع زاد مان بھی لیا جائے۔ اور پھر ایک ہندوستانی دماغ کا کمال تو اسے بیسویں صدی کا ایک شاہکار سمجھنا چاہیئے۔

میں نے اس وقت تک سوا سو کے قریب افسانے لکھے ہیں۔ اس مجموعے میں پندرہ شائع ہو رہے ہیں۔ سب کے سب ایسے ہیں۔ جو میرے شائع ہونے والے مجموعہ کے ساتھ شائع ہونے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ ان کو شائع کرنیکی اجازت محض اس لئے دے دی ہے تاکہ ان کو صدمہ نہ ہو۔ صدمہ اس لئے کہا ہے۔ کیونکہ آخر یہ بھی میری ہی تخلیق ہیں۔ اور ان کا مجھ پر حق ہے۔ اور اس حق سے میں انہیں محروم نہیں کرنا چاہتا۔ میرے افسانے بھی رومانی زندگی کے قریب تر ہیں روحانیت کا میں دشمن نہیں اور نہ اس بات پہ مصر ہوں۔ کہ روحانیت ہی زندگی کی نجات ہے۔ اور نہ اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ وہ ادب جسے ہم زندگی کے قریب تر کہکر پکارتے ہیں اور اسکی برتری کا عمل اور جذبات کے ذریعہ اظہار کرتے ہیں کہ وہ انسانی زندگی کیلئے نجات کا ذریعہ ہے۔ اگر بنیادی طور پر دیکھا جائے تو اس زندگی کا تعلق براہ راست ایک ایسی قوت سے ہے جس کا مقام ان تلخ حقیقتوں سے کہیں بلند ہے اور یہ تمام تلخ حقیقتیں اس ایک حقیقت کے کھو جانے سے زیادہ تلخ بنتی چلی جاتی ہیں۔ پھر

مایوسیاں اُبھر آتی ہیں۔ زندگی ناکام اور ہر لذت سے محروم نظر آتی ہے۔ فقیر بھوکا ہے اور مزدور غیر مطمئن ہے۔

ادب درباریوں کی زینت رہا ہو۔ یا مزدور کی ذلت کا رونا وہ ہمیشہ انسانی زندگی کے مدارج کے ساتھ ساتھ بنتا اور بگڑتا رہا ہے اور پھر اس کا کھوکھلاپن ہمیشہ یہ احساس دلاتا رہا ہے۔ کہ اس کی بقا کیلئے پختگی کی ضرورت ہے۔ ایک دور گیا دوسرا دور آیا۔ اور پھر اس کی جگہ تیسرے نے لی۔ یہاں تک کہ موجودہ نسل کو اپنے ادبی کھوکھلے پن کا احساس شدت سے ستانے لگا۔ اور ہم بادشاہ اور مزدور دونوں پر یکساں طور پر کھُلم کھلا نکتہ چینی کرنے لگے۔ بادشاہت مر کر رہ گئی۔ اور اس کے بوجھ تلے دبا ہوا مزدور کراہتا ہوا سنائی دیا۔ اس کی آہ و بکا کو گوش گزار کرنا فرض انسانی میں شامل کر لیا گیا۔ جس کا لازمی نتیجہ جنگ اور انسانی خون کی ارزانی ثابت ہوا۔ مجھے ترقی پسند تحریک سے کبھی لگاؤ پیدا نہیں ہوا۔ شاید اس لئے کہ ہمارا مزدور طبقہ میرے اتنا احساس واقع نہیں ہوا۔ کہ وہ اپنا رتبہ خود پہچان سکے۔ مغرب میں مزدور مزدور معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایک ریفارمر۔ Reformer کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اور اپنی محنت کا صلہ پورا پورا پاتا ہے۔ اسمیں تناؤ ہے۔ خودداری ہے۔ برعکس اس کے ہمارا مزدور اپنی

ذلالت کی وجہ سے کسی معراج کا مستحق نہیں۔ کیونکہ مشرق میں سرمایہ دار ہو کر بھی مزدور کے دل سے اس بات کا احساس نہیں جاتا۔ کہ وہ مزدور کا مزدور ہی ہے۔ ہو سکتا ہے۔ میرا یہ نظریہ میری یہ ضد میری ذات تک محدود ہو۔ لیکن یہ بات ضرور ہے۔ کہ ہماری سماج اور ادب میں ترقی پسندی اور مزدور کی حمایت وہ درجہ حاصل نہیں کر سکی۔ جس کا پیش کرنے والوں کو گمان تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ تحریک کوئی نئی تحریک نہیں۔ اس تحریک کے اسباب کسی نہ کسی صورت ملک میں پہلے بھی موجود تھے۔ اور وہ ادیب جنہوں نے آج سے بیس بائیس سال پیشتر ادب میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ یقیناً ترقی پسند اور مزدور کے حامی بھی تھے۔ اور جو کچھ انہوں نے لکھا یا پیش کیا۔ کسی بڑی تحریک کا پیش خیمہ تھا۔ انہوں نے بھی اپنی تحریک کا احساس پوری شدت سے دلایا تھا۔ میرے اکثر دوست جن کا ہاتھ اس تحریک میں تھا۔ زیادہ تر انقلابی خیالات کے حامی تھے۔ اور وہ بھی روسی ادب کو سماج اور قوم کی نجات سمجھتے تھے۔ چکی پیسو روٹی کھاؤ۔ جیسی نظمیں اور ایسے ہی افسانے اس دور کی زندگی میں کثرت سے ملتے ہیں۔ اس جدت پسندی کے ساتھ ساتھ ان ادیبوں کو بھی قدامت پسندی اور فرسودہ خیالات سے عناد اور نفرت تھی۔ وہ بھی

. . . دل سے چاہتے تھے۔ کہ ملک کو ترقی پسندی اور تازگیٔ خیالات سے مالا مال کر دیا جائے۔ انہوں نے نثر و نظم سے الگ تنقید نگاری کی ایک خاص راہ قائم کی تھی۔ اور نیاز مندانِ لاہور کے نام سے لڑائیاں مول لی تھیں۔ جس کا نتیجہ اتنا شاندار رہا۔ کہ آج ہمارے ادب کا یہ حصّہ ایک معیاری درجہ حاصل کر گیا ہے۔ اور ملک کے طول و عرض میں بڑی سرعت سے پھیل رہا ہے۔

۱۹۲۰ء میں جو بیداری رونما ہوئی وہ نئے ادب اور نئے آرٹ کا آغاز تھی۔ جہاں تک فنون کا تعلق ہے۔ وہ ہمارے جدید آرٹ کا بنیادی پتھر تھی۔ اس میں کوئی ایسی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ جس سے ایک ہیجان اٹھتا۔ اور ایک ہلچل پیدا ہوتی۔ اور آرٹسٹ اپنے موقلم سے ہندستان کے چہرے پر کوئی ایسا اجنبی اور انوکھا رنگ دے مارتا۔ کہ وہ پیشانی کا تلک بن کر ایک نیا جہان اور ایک نیا آسمان ہو کر چمک اُٹھتا۔ پہلے بھی نئے آرٹ نئے ادب کی مخالفت شدّت کے ساتھ عمل میں آئی تھی۔ اور باوجود ہزار کوشش اور مخالفت کے ترقی پسندی اور قدامت پسندی دوش بدوش چل رہی تھیں اور آج بائیس سال گزر جانے کے بعد بھی قدامت پسندی ترقی پسند ادب کے دوش بدوش کھڑی ہے۔ اور ہر ترقی پسندی کا دعویٰ

پیش کرتے ہوئے بھی کوئی راشد الخیری کے آنسوؤں سے لے کر ٹیگور کی ٹیگوریت کو برملا برا کہنے کی جرأت نہیں رکھتا اور اپنے موجودہ آرٹ اور ادب کو دیکھتے ہوئے اور ہر دعوی کا ثبوت موجود ہوتے ہوئے بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا۔ کہ جدید آرٹ اور ادب میں صاحب طرز ادیب اور فن کار اس کثرت سے موجود ہیں۔ کہ ہمارے ادب کا مستقبل قطعی طور پر محفوظ ہے۔ ترقی پسند ادب کی بنا مزدور کی حمایت یا معاشرتی نظام کے مطالعہ پر نہیں رکھی گئی۔ یہ ادب محض ردِ عمل ہے۔ اس جذباتی تحریک کا جسے نہ مزدور سے واسطہ تھا۔ اور نہ اس کی حمایت مقصود تھی۔ کیونکہ فیشن ایبل ادیب اور سرمایہ دار کا ایک ہی درجہ ہے۔ ورنہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کے نزدیک آجکل نہ مزدور سے کوئی واسطہ رکھتا ہے۔ اور نہ اس کے گاڑھے پسینے کی بو سے اور نہ اس کے خون بہنے سے۔ اس لئے مزدور کی حمایت اور معاشرتی نظام سے بیزاری ایک فیشن ایبل ادب اور عیاشی کے سوا کچھ نہیں۔

آج ہم زندگی میں لذّت کی کمی کا احساس کرنے لگے ہیں۔ للچا بڑھ گیا ہے۔ بھوک کی نئی کیفیتیں سوجھنے لگی ہیں۔ جنس وہی ہے۔ مگر اس کی صورت دوسری ہو گئی ہے۔ پہلے گناہ گناہ خیال کیا جاتا تھا

اس کے گناہ ہونے کا احساس تھا۔ اب گناہ بے لذت ہے اس کی ذمہ داری کی ہیبت کو دلوں سے اٹھا دیا گیا ہے۔ جس سے زندگی میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اور ہم آرٹ کو کھلے طور پر فن برائے زندگی کہنے پر فخر محسوس نہیں کرتے۔ دیکھتے دیکھتے اور زندگی کے ساتھ چلتے چلتے یوں بھی محسوس ہونے لگا ہے۔ جیسے ہم ایک صدی آگے چلے گئے ہیں۔ یا یوں کہہ لو۔ کہ ہم ایک ایسے مقام پر کھڑے اس جگہ کو دیکھ رہے ہیں۔ جہاں انسانی خون سے رنگی ہوئی زمین ایک سر آب پیدا کر رہی ہے۔ ان تمام تبدیلیوں اور کوششوں کی نوعیت اور ضرورت ہی ایسی ہے۔ کہ ہم ہر تخلیق کو انسان کی مشترکہ ملکیت بنا دیں۔ اور ہر ایک کو حق حاصل ہو۔ کہ وہ فن کار کی ذہنی عیاشی کا حصہ دار کہلائے

میں فطرتاً فحش پسند نہیں۔ مگر تحریک جنسی سے کہ وہ زندگی کا ایک تندرست جذبہ ہے۔ فرار بھی نہیں۔ جہاں تک زندگی کا تعلق ہے بعض اوقات ہم لہروں کے الجھنے میں جنسیت کے اسباب محسوس کرتے ہیں خصوصیت سے اس وقت جب وہ ایک دوسرے سے گلو گیر ہو ہو کر قہقہے لگا رہی ہوں اور نہایت بیتابی سے پیچھے ہٹتی ہٹتی پھر ایک بار ایک دوسرے سے ملکر گتھم گتھا ہو جاتی ہوں۔ اور دیر تک اُن کے درمیان کوئی قہقہہ سنائی نہ دے۔ غالباً اس سے زیادہ جنسیت کا تصور ایک

آدھ پھل میں بھی موجود ہے۔ خصوصیت سے جب وہ پھل ہم ایک عورت کو پیش کر رہے ہوں۔ اور وہ اس کو لیتے میں جھجھک محسوس کرے حیوان فطرتاً فحاشی کے عادی ہوتے ہیں۔ اور یہی ایک وجہ ہے۔ کہ ہم انہیں ہر روز ہر حالت میں دیکھنے کے باوجود بھی اُن کے رجحانات کے متعلق نہ کوئی لذت تلاش کرتے ہیں۔ اور نہ اُن کی مخالفت پر کمربستہ ہوتے ہیں۔

افسانوں میں فحاشی بہ حسن یقینی طور پر یورپ کی پیداوار ہے جہاں انسانی فطرت کے ساتھ کھلم کھلا سازش کی جاتی ہے۔ اور ہر روز اسے اس رسم کا عادی بنانے کے لئے ہزاروں وسائل پیدا کئے جاتے ہیں تاکہ انسان کی سنجیدگی بے حیائی اور بے غیرتی میں بدل جائے۔ اور اُس میں یہ تمیز نہ رہے۔ کہ آخر انسان کو اپنا جسم چھپانے کی ضرورت کیا ہے۔ برہنگی کی تائید میں ناگا کلبیں اور ایسی ہی انجمنیں ظہور میں آتی رہی ہیں۔ دُنیا بھر میں شاید پیرس ہی ایک ایسی جگہ ہے۔ جہاں اپنے مہمانوں کے لئے جذبۂ جنسی کو ابھارنے کے لئے ایسے ایسے ذلیل ذرائع استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ کہ ان کے دیکھنے سے انسان انسانی فعل اور شعور پہ شرم سے جھک جاتا ہے۔ اور صدمہ ہوتا ہے کہ یہ وہی انسان ہے جو خدا کا نائب ہے۔ اور جس کے سامنے اس کے

مقدس فرشتوں نے سر جھکا دیا تھا۔ وہاں شرم سے گردنیں جھک جاتی ہیں۔ اور انسان کا دل اپنے آپ پر ملامت کرنے لگتا ہے یہ اُن فحاشیات کی طرف اشارہ ہے۔ جو انسانوں کی انسانیت چھوڑ جنسی لذتوں کو بھی لے ڈوبی ہے۔ مگر اُسی شہر میں اور اُسی فضا میں فحاشات کو پیش کرنے کے اور اسباب بھی موجود ہیں جس میں سلیقہ موجود ہے۔ اور انسان تھوڑی دیر کے لئے یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ نشتر زہر میں تو بجھا ہوا ضرور ہے۔ مگر ہے فن اور وہ فن جو برائے زندگی ہو۔ مجھے وہاں ایک ایسی جگہ جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ جہاں جذبۂ جنسی کو اس ڈھنگ سے اُبھارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کہ اس سے ذوقِ نظر کی تسکین ہوتی تھی۔ وہاں کئی پُر پیچ راستے کاٹ کر ہمیں ایک پُر تکلف کمرے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ اس کمرے کی آرائش کا ذکر کوئی اتنا آسان نہیں۔ کہ میں بغیر کسی نظم کہنے کے بیان کر سکوں۔ ہاں جتنی بھی تصویریں آرائش کے لئے وہاں لگی تھیں۔ اُن میں کوئی بھی تصویر برہنہ نہ تھی۔ اور نہ کسی عورت کی تصویر کے سینوں میں وہ تناؤ موجود تھا جس سے جنسی لذتوں کو ابھارا جا سکتا ہے۔ مالکہ جو اس درسگاہ کو چلاتی تھی چند لمحوں کے بعد ہمارے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ اور وہ لڑکی جو اس درسگاہ کے پُر پیچ راستوں سے ہمیں آگاہ کرتی ساتھ ساتھ چلی آتی تھی جھک کر

سلام کرنے کے بعد رخصت ہوگئی۔ اُس وقت اُس کے نیم عریاں جسم
اور اس کی آنکھوں کے تصور سے صاف ظاہر تھا۔ وہ مالکہ کی موجودگی
میں کھڑے رہنے کا مجاز نہیں رکھتی۔ اس کی حیثیت ایک غلام سے
بھی گئی گزری تھی۔ وہ ایک زر خرید غلام تھی۔ جس کے رُوئیں رُوئیں
پر اُس کے مالک کا احسان تھا۔ اس درسگاہ کی مالکہ تقریباً دنیا کی ہر زبان
کے وہ الفاظ اور فقرے دہرا سکتی تھی۔ جس سے اس کی تجارت کو فروغ
حاصل ہوتا تھا۔ مَیں نے محسوس کیا تھا کہ وہ ایشیائی زبانوں میں عربی
زبان پر کافی عبور رکھتی ہے۔ اور یورپ کی تقریباً ہر بڑی زبان اس کی
مادری زبان معلوم دیتی تھی۔ جب اس نے یہ معلوم کر لیا۔ کہ مَیں اُس
کا ایک ہندستانی مہمان ہوں۔ تو اُس نے بڑے راجاؤں اور نوابوں
کا تذکرہ اِس بے تکلفی سے شروع کر دیا ۔ جیسے وہ اُس کے معمولی
آشنا ہیں۔ پھر اُس نے اپنی لڑکیوں کی تعریف کرنی شروع کی۔ اور کہا
اتنی خوبصورت مصفا لڑکیاں، پیرس بھر میں آپ کو نہ ملیں گی۔ اور کہا
میری لڑکیوں کے جسم مصر اور ہندستان کی داسیوں سے کہیں خوبصورت
ہیں۔ مَیں نے کہا۔ ویسے ہی پاک اور مصفا بھی یقیناً وہ اس کا مطلب
نہیں سمجھی تھی۔ کیونکہ بڑے طمطراق سے اس نے کہا تھا۔ ان کے
سڈول جسم پتھر سے پتھر دل کے اندر للچاپیدا کر سکتے ہیں۔ اور یہ

درسگاہ محض روپیہ کمانے کا ادارہ نہیں۔ یہاں انسان کے ذوقِ نظر کا امتحان ہوتا ہے۔ اور اُسے زندگی کے سامنے کھڑے ہونے کا موقعہ بھی ملتا ہے۔ پھر ہم نے اس کی لڑکیوں کے دیکھنے کے لئے اُس کے بتلائے ہوئے پروگرام کے مطابق ٹکٹ خرید کئے۔ اور وہ ہمیں اپنی مُصفّا خوبصورت اور سڈول جسموں والیاں لڑکیاں دکھانے کے لئے ایک دوسرے کمرے میں چلنے کے لئے درخواست کرنے لگی۔ جب ہم اُٹھنے کو تھے۔ تو ہمیں محسوس ہوا۔ چھت کا فرش سرک رہا ہے۔ اور یوں معلوم دے رہا ہے۔ جیسے پاؤں تلے زمین گھوم رہی ہے اور ہم اوپر ہی اوپر جا رہے ہیں۔ یہ سب ایک لمحہ کے اندر اندر عمل میں آیا تھا۔ اور ہم بیٹھے بٹھائے دوسرے کمرے کی دیواریں دیکھ رہے تھے اور سامنے والی دیوار ایک سٹیج کی صورت نظر آرہی تھی۔ جس پر کم و بیش کوئی پچیس لڑکیاں بالکل برہنہ نظر آرہی تھیں۔ اور ان کے کھڑے ہونے کا انداز بہت دلفریب تھا۔ ہر لڑکی کی گردن میں بڑی نفاست سے ایک لوکٹ لٹک رہا تھا۔ جس پر اس کا نمبر کندہ تھا یہ لڑکیاں اٹھتی بیٹھتی اور چلتی بھی تھیں۔ اسی طرح کوئی دوسو کے قریب لڑکیاں اس سٹیج پر باری باری اپنے حسن کی نمائش کرتی رہیں۔ مجھے یاد ہے۔ ہم نے ایک چودہ نمبر کی لڑکی کو اس کے حسن کی بے حد

داد دی تھی ۔ اس میں دلفریبی کے ساتھ ساتھ ایک جھکاؤ ایک
شرم نمایاں تھی ۔ وہاں کا قاعدہ تھا۔ جس لڑکی کو پسند کیا جائے
وہ لڑکی ایک علیحدہ کمرے میں ہماری ملاقات کے لئے حاضر رہتی ہے
اور اس ملاقات کے الگ دام دینا پڑتے ہیں ۔ یہ درسگاہ کی مالکہ نے
پہلے ہی بتا دیا تھا ۔ مالکہ نے ہمیں اشارہ کیا ۔ کہ ہم سٹیج کی طرف قدم
بڑھائیں ۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی ۔ جب ہم نے دیکھا ۔ کہ جس
نظارے سے ہم بہت محظوظ ہوئے تھے ۔ اور جوانی کے عالم میں حسین
تیتلی لڑکیوں کو ہم نے عریاں رقص کرتے دیکھا تھا ۔ وہ محض عکس کی
صورت ایک ایسی دیوار پر رقص کر رہی تھیں ۔ جو آئینہ کی بنی ہوتی ہے
وہ وقت فرطِ شوق سے بھرا ہوا وقت تھا ۔ جب ہم اس دیوار سے
ٹکرا گئے تھے ۔ اور ہمارے اپنے عکس اسی دیوار پر نظر آ رہے تھے
حقیقت میں وہ لڑکیاں ہمارے پیچھے کہیں ایسی اونچی جگہ پر کھڑی ایکٹ
کر رہی تھیں ۔ جس کا عکس ہی ہم دیکھ سکتے تھے ۔ اور ننگ اور فحاشی
کا لطف بطور فن کے اٹھا سکتے تھے ۔ چودہ نمبر کی لڑکی جس کا انتخاب
کیا تھا ۔ اور جس کو محض جسمی حیثیت میں دیکھنے کی قیمت ادا کی تھی ہمارے
سامنے کھڑی تھی ۔ اس کا حسن فروزاں اس کی نگاہِ پُر فریب شبنمی
عُریاں جسم جیسے وہ شراب سے نہا کر اٹھی ہو ۔ عجیب و غریب نظر

آ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہوگی۔ اُسے کسی جنسی لذتوں کے ماہر شخص نے سب کچھ سکھایا ہوگا۔ وہ یقیناً آبگینہ کی طرح چھلکتی محسوس ہوتی تھی۔ اور خود اپنے حُسن کی آئینہ دار نظر آ رہی تھی۔ وہ خریدی جا سکتی تھی۔ وہ ہر قیمت پر بکتی تھی۔ مگر اُس کے دیکھنے اور اس سے چھونے کی الگ الگ قیمت تھی۔ حقیقی طور پر عورت کا ننگ اتنا رُوح پرور نہیں۔ جتنا کہ اس میں آرائش اور لباس کا حصّہ ہے۔ اُس نے ایک سُرخ جُوتا پہن رکھا تھا۔ سر کے بالوں میں بھی ایک سُرخ پھُول لگا رکھا تھا۔ اور سب سے زیادہ فحاشیات کو ابھارنے والی جدّت اس کی جائے مخصوص پر ایک زنجیر اور ایک انگور کا پتہ تھا۔ انسان کتنا بھی چاہے۔ اِس کی خواہشات اس منظر کی دلفریبی سے کتنی بھی زیر و زبر ہوں مگر۔ ان عجیب احساسات کو اِن وحشت خیز ولولوں کو بیان نہیں کر سکتا۔ جو اس منظر کو دیکھ کر محسوس کرتا ہے۔ پیرس کی اس درسگاہ میں لڑکیاں عریاں برہنہ معہ اپنے تمام جنسی اور جسمانی اوصاف کے اس طرح چل پھر رہی تھیں۔ جیسے کوئی گرمی کی شدّت سے اپنے جسم پر کپڑا پسند نہ کرے۔ یا یہ کہ انسانی جسم کو اس سے زیادہ ستر ڈھانپنے کا فطرت سے حق حاصل نہیں۔ اس رات پیرس میں برف پڑ رہی تھی۔

لوگ سردی کے مارے سکڑتے جا رہے تھے۔ ہاتھ باہر نکالنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اور یہ امکان موجود تھا۔ کہ صبح تک بہتوں نے ٹھٹھر ٹھٹھر کر جان دے دی ہو۔ مگر وہ گھر جہاں پیرس کے لوگ اپنے مہمانوں کی طبیعتیں بہلاتے ہیں۔ وہاں نہ سردی کا دخل اور نہ گرمی کا رونا ہے۔ اور یہ وہی پیرس ہے۔ جس کی آرٹ گیلری میں لیونارڈو کی "مونالیزا" روبنز کی موٹے موٹے جسموں والی عریاں تصویریں ریمبارنٹ کے شاہکار۔ سیزاں کی غسل والیاں۔ ڈیگے کی ناچ والیاں۔ گوگین کی تہٹی کی رہنے والیاں بھدیاں اور موٹیاں اور پھر میڈ گلینی کی لمبی لمبی گردنوں والی عورتیں، لوور کی دیواروں پر آویزاں ہیں۔ اور لوگ ان کو دیکھتے دیکھتے اور مصنف ان کے متعلق لکھتے لکھتے اور شاعر نظمیں کہتے کہتے ابھی تک نہیں تھکے۔ یہاں ہزاروں تصویریں عریاں ہیں۔ اور لاکھوں انسان مرد۔ عورتیں اور بچے روزانہ انہیں دیکھتے ہیں۔ اور انہیں ان کے خلاف کبھی زہر اگلنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ بلکہ ان کا ننگ فحاشیات کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ یا وہ جمالیات اور انسانی جذبات پر پورا اترتی ہیں۔ عریاں تصویریں بنانے میں مغربی آرٹسٹوں کو جو کمال حاصل ہوا۔ وہ مشرق کا حصہ نظر نہیں آتا۔ بدھ سے لے کر مغل۔ جے پور۔ کانگڑہ۔ حیدر آباد دکن

تک کے مصوروں نے اپنے نقطۂ نگاہ سے بہت سی ننگی تصویریں بنائی ہیں۔ بدھ کے مجسمے اکثر عریاں ملتے ہیں۔ سو اسیلوں اور دیوتاؤں کے مجسمے بھی بغیر ستر کے ملتے ہیں۔ مگر ان میں جنسی اور نفسیاتی احساسات کا وہ ولولہ موجود نہیں۔ جو مغربی مصوروں نے اپنی تصویروں میں اپنے لازوال کمال سے بھر دیا ہے۔ اگر ہم بورگرو۔ روبنز۔ ریمبارنٹ کا مقابلہ کریں۔ تو یہ آرٹسٹ اس قدر مختلف نظر آتے ہیں۔ کہ عریانی کا فلسفہ ہی بدل جاتا ہے۔ بورگرو زیادہ نفس پرست تھا۔ اُسے تناسبِ اعضا کی بناوٹ اور سڈول جسم کا للچاؤ ضرور تھا۔ اس کے سامنے اس کی تصویریں خریدنے والے امرا۔ لارڈ۔ کاؤنٹ تھے۔ روبنز اس طرح معلوم دیتا ہے۔ جیسے وہ کسی ایک عورت کو اس کی عریاں تصویریں بنا بنا کر یقین دلا رہا ہے۔ کہ موٹاپے میں بھی ایک خوبصورتی ہے۔ اور اس خوبصورتی کی حقیقت صرف ایک باکمال آرٹسٹ ہی سمجھ سکتا ہے۔ ریمبارنٹ کی عریاں تصویروں میں ان دونوں آرٹسٹوں کے نظریے کی ترجمانی ملتی ہے۔ وہ عورت کی عریانی میں اس لذت کو تلاش کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جو خود اس کے جذبات پر بجلیاں گراتی تھی۔ اور وہ اِن سے الگ ہو کر دیکھتا اور سمجھتا تھا۔ کہ یہ ریمبارنٹ کی شخصیت سے کہیں ادنیٰ درجے کی چیز تو نہیں

مثال کے طور پر اس نے ایک عورت کی تصویر بنائی ہے۔ جس کی چھاتیاں ڈھلک تو ضرور چلی ہیں۔ مگر ان میں زندگی کا شعلہ موجود ہے۔ اس کا پیٹ بڑھ گیا ہے۔ مگر وہ تناؤ لئے ہوئے ہے۔ جس سے اس کا نچلا حصّہ چمک اٹھتا ہے۔ اور اوپر کا تمام حصّہ اس طرح نظر آنے لگتا ہے۔ گویا وہ ایک ماں کی خوبصورتی لئے ہے۔ جس نے اپنی چھاتیوں کو دودھ کی لذت ہی نہیں۔ بلکہ ایک ایسے پیار میں سرشار بنا رکھا ہے۔ جسے بچہ بوڑھا۔ جوان سب زندگی کے خون میں کھولتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس تصویر کو دیکھنے سے بعض اوقات یوں بھی محسوس ہوتا ہے۔ کیا مرد میں عورت کو چھونے کی طاقت ہے۔ اور کیا یہ طاقت اسے قبول کرے گی۔ ریمبرانٹ کے موقلم کی ہلکی سی جنبش نے اس تصویر کو ننگ اور عریانی میں بھی ماں کی حیثیت سے دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس کی ہر عریاں تصویر میں ایک مختلف جذبہ ہے۔ اور اس جذبے کے زیرِ اثر اس کی اپنی شخصیت کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس طرح جدید آرٹسٹوں میں انگرے۔ ڈیگے سیزاں۔ پیکاسو۔ مڈگلینی۔ گوگین کی عریاں تصویروں میں ایک یگانگت ضرور ہے۔ مگر ڈیگے کچھ کہتا ہے۔ اور سیزاں کچھ کہتا ہے۔ ہر ترجمان آرٹسٹ کا مقصد عریانی سے وہ نہیں ہوتا جس عریانی کا مطلب انسان کو غیر انسانیت کی طرف مائل کرتا ہے۔ ان کا مقصد عورت کے ان

جذبات اور تاثرات کی ترجمانی مقصود ہے۔ جو اس کی خوبصورتی کو جاوید بناتے ہیں۔ ہر عورت ماں پہلے اور محبوب بعد میں ہے۔ یہ جرأت آج بھی نہیں ہوتی۔ کہ ہم ان تصویروں کے بنانے والوں کو خون آلود چھیڑ چھاڑ سے داغدار کریں اور ان پر بہتان لگائیں۔ کہ انہوں نے فحاشیات کے پھیلانے میں حصّہ لیا تھا۔

دیکھا جائے تو ننگ دیکھنے کے لئے اپنے آپ کو ستر کا جامہ پہننا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کہ جنسی بھوک کے مارے ہوؤں کو لباس میں بھی عریاں اور فحاشی نظر آسکتی ہے۔ اکثر عورتیں یہاں عورت سے مراد مغربی نہیں مشرقی عورت ہے۔ جسے اپنے جسم کے ستر کا احساس ہمیشہ رہا ہے۔ دیکھا جائے۔ تو وہ اپنے لباس میں بھی اپنے بدن کے تناؤ اور خوبصورتی میں حیا محسوس کرتی ہے کیونکہ اس کو دیکھنے والی نگاہیں اس کے اندرونی جذبات سے بھی باخبر ہیں۔ ہمارے ہاں جنسی لذتوں کا مظاہرہ کوئی نئی کہاوت نہیں ہے پنڈت کوکا سے لے کر ایک بازاری کسبی تک نے اس لذت کا احساس دلایا ہے۔ سعدی اور کالی داس تک نے انسان کی اس کمزوری کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ہر انسان کو ابھی اپنے آپ کو سمجھنے کے لئے اور کچھ سیکھنے کے لئے بڑے بڑے اہم تجربات کی ضرورت ہے۔

جدید لکھنے والوں میں یہ جذبہ ان کا اپنا نہیں۔ غالبًا ہر پڑھا لکھا
انسان خود بخود افراد کے نظریئے کی طرف جھک جاتا ہے۔ اور اس کا غلام
ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور یہ سمجھنے سے بھی عاجز نظر آتا ہے۔ آخر افراد کا اس
لذت پر روشنی ڈالنے کا صحیح مقصد کیا ہے پھر بھی ہمارے بعض لکھنے
والوں نے ہمیں ایک نیا راستہ دکھایا ہے۔ ہمارے اندر آج جنسی
ہیجان کا ایک سبب یہ بھی نظر آتا ہے۔ کہ ہم جنسی لذتوں کے امکانات
سے بے خبر ہیں۔ اور بے خبری ہمیشہ ہی جھنجلاہٹ کا باعث ہوتی ہے
چاہے اس کی صورت نفرت ہو یا پسند۔ فحاشیات کا درجہ اتنا گہرا
ہوا نہیں۔ جتنا کہ ہماری موجودہ سوسائٹی محسوس کر رہی ہے۔ اور
سمجھتی ہے۔ کہ ان ترقی پسند مصنفین نے انکی تہذیب کو کھوکھلا اور ننگا کر دیا
ہے۔ اور اخلاق کی جڑ ہلا دی ہیں۔ وہ جو چھپ چھپ کر گناہ کرنے
کے عادی ہیں۔ اور چھپ چھپ کر ایسا ادب پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ وہ
اخلاقی بودے اور ڈرپوک ہیں۔ ان کو چاہیئے۔ وہ اپنی کمزوریوں کا اظہار
برملا کریں۔ وہ اس ادب کو عیوب کے نکتہ نگاہ سے پڑھیں۔ تاکہ ان کا
اپنا عیب کوئی نئی صورت اختیار کر جائے۔ اور اس برگشتہ ذہنیت
کا خاتمہ ہو جائے۔ جس کی بنا پر ہم بجائے اپنے دوسروں کو ذلیل
سمجھنے لگے ہیں۔ کیا یہاں کسی نے کسی عورت کو صحیح معنوں میں

ننگا دیکھا ہے۔ کیا کسی کو خوبصورت فارم کا تصور ہے۔ اور اگر ہمارا یہ تصوّر مکمل ہو۔ تو ننگ اور عریانی کی شکل وصورت ہی اَور نظر آنے لگتی ہے ہمارے ترقی پسند ادیبوں میں بھی تو اتنی جرأت نہیں۔ کہ وہ کسی کسبی کی قیمت ادا کر کے بھی اس کو جرأت سے ننگا دیکھ سکیں۔ ہماری موجودہ زندگی کے لئے بڑے سخت اور خطرناک حملوں کی ضرورت محسوس کریں اور تمیز کریں۔ آخر ایک سادہ زندگی ہیں اور اس زندگی میں جس میں شعریت صلاحیت۔ ذوق نظری اور معنویت بھی ہو۔ کیا فرق ہے — اصولی طور پر ہم کیوں جھنجھلا اُٹھتے ہیں۔ اس کا سبب ہے۔ کہ ہمیں اپنی زندگی کو چھوڑ کبھی محفلِ ادب سے بھی براہِ راست واسطہ نہیں پڑا۔ اور نہ کبھی ہم نے بحیثیت مجموعی اس کا مطالعہ کیا ہے۔ ہمارے ادب کا دائرہ جوں جوں وسیع ہوتا چلا جائے گا۔ ہم ان خرابیوں کو اچھائیوں میں بدل لیں گے۔ جو ہماری کم علمی اور کم نگاہی کے سبب نظر آتی ہیں۔ ہمارا ذہنی تصوّر نہایت پست ہے۔ ہمیں نفس پر قابو اور نہ اپنی سوشل ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ اور نہ یہ احساس ہے۔ کہ ہم نے کوئی معیار بنایا ہے۔ یا اپنے پڑھنے والوں کو ایک راہ پر لا کھڑا کرنا ہے۔ یا انہیں مجبور کر دینا ہے۔ کہ وہ ہر اس تحریر کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کریں۔ جو نفسیاتی ترغیب کو جانچنے کا ایک وصف

رکھتی ہے نگاہ کی تہہ عریانی دماغی کیفیت کا خاکہ ہے۔

ہو سکتا ہے۔ ہم قدیم دل بہلانے والے قصے کہانیاں، چہار درویش الف لیلیٰ وغیرہ کو برا لگتے ہوئے حق بجانب ہوں۔ لیکن غور طلب امر یہ ہے۔ ترقی پسندی کا بھڑکیلا پتلا کہیں۔ ہماری نسل کو فکر اور تصورات سے پرے ہٹا کر پہلے سے بھی بے حس نہ بنا دے اور ہم فرسودگی بدعتوں کا رونا روتے روتے ایک ایسی بدعت کا شکار ہو جائیں جس کی موت دنیا کے مٹنے تک نفرت کا موجب بنی رہے۔

عریانی اور فحش نگاری ہر دور اور ہر زمانہ میں ہوتی ہے۔ موجودہ نظریوں ہی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ فرعون سے لے کر بدھ تک نے اپنے جسم کو نہ ڈھانپا تھا۔ اور ممکن ہے۔ دونوں کا نظریہ جنسی ہو۔ مگر دونوں کے درمیان اتنا ہی فرق ہے۔ جتنا انکی شخصیتوں نے اپنے آپ کو منانے میں عظمت اور اعتراف حاصل کیا ہے۔ میں آرٹسٹ ہوں۔ میں نے کئی برہنہ تصویریں بنائی ہونگی۔ ان میں جنسی لذتوں کا احساس بھی ہو گا۔ مگر میں نے دیکھا ہے۔ انکو دیکھ کر کنواری لڑکی نہ بیاہی ہوئی۔ عورت نہ عالم نہ مولوی کوئی بھی ان سے نفرت کرتا ہوا نظر نہیں آیا ——— میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ عریاں ادب عریاں تصویر جذبات کو ضبط اور اخلاق سکھاتی ہے

اگر بنانے والے یا لکھنے والے کا صحیح مفہوم ننگ اور عریانی نہ ہو۔

ترقی پسند ادب کی گونج نے ہمارے ادب کی فضا میں اک شور سا پیدا کر دیا ہے۔ اس میں گونج ہے۔ اس میں صداقت ہے۔ سب کچھ ہے۔ اور میں دل سے اس کا مداح ہی نہیں۔ بلکہ مسلکِ زندگی اور میرا فن بھی وہی ہے۔ مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ وہ بھی زندگی کے ہنگاموں کا میدان بنا رہا ہے اس میں بھی فرسودہ بدعتوں کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اور اس وقت کے ترقی پسند ادب کے بانی اور ترقی پسندی کا پرچار کرنے والوں کے پیشِ نظر بھی وہی کچھ تھا۔

جو آج کے دعوے داروں کے پیشِ نظر ہے۔ وہ بھی چیخوف گورکی۔ موپساں۔ ٹالسٹائی کے حامی اور ان کے شاہکاروں کو نئی جدت نیا ادب نئی افتاد نئے نئے امکانات کہہ کر شائع کرتے تھے۔ اور آج کے ترقی پسند ادیب بھی انہیں کو اپنا پیشِ امام مانتے اور ان کی کہی ہوئی باتوں کو اپنے الفاظ اور الہام سمجھتے ہیں۔ ان کی تصنیفوں میں بھی وہی حقیقتیں چھپی ہوئی سسکیاں بھر رہی ہیں۔ جو روسی

اور فرانسیسی ادیبوں کی تصانیف میں موجود ہیں۔ یورپ میں ترقی پسندی کے کئی دور آئے۔ کئی فیشن کی طرح چمکے۔ اور مٹ گئے۔ ان کا سلسلہ اور زندگی کا تسلسل ویسا ہی رہے گا۔ اور ہمارا سلسلہ دوسروں کے شانوں پر ہے۔ جس میں زندگی اور موت کی تشخیص ابھی بہت مشکل ہے . . . ایک آرٹسٹ کے لئے ضروری ہے۔ کہ فاقہ کرے وہ بھوک کی تلخی سے ابھرے وہ زندہ رہے۔ اس طرح جس طرح دنیا کے بڑے لوگ خود اعتمادی سے زندہ رہے ہیں . . .

حصولِ زر ایک فریب اور ایک بچاؤ ہی نہیں بلکہ موت ہے۔ تنہائی کے احساسات جنسی بھوک اور ضبط۔ مزدور کے حقوق سے کہیں زیادہ ہیں۔ . . . اور یہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ کہ ہم مطالعہ کریں کہ آخر مزدور کیوں زر کے لئے مارا مارا پھرتا ہے۔ اور کیوں وہی سکہ حاصل کرنا اس کا نصب العین ہے۔ جس پر بادشاہ کی تصویر کندہ ہے۔

مغرب میں جب کوئی طوفان اٹھتا ہے۔ وہاں جب کوئی تحریک عملی صورت اختیار کرتی ہے۔ تو وہ کتنی ہی نئی کتنی ہی ترقی پسند کیوں نہ ہو۔ وہ ان کی اپنی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر مغرب کی جدید مصوری ہی کا اگر جائزہ لیا جائے۔ جن کو باغی سرکش۔ ترقی پسند اور یہاں تک کہ

پیغمبر کہا گیا ہے۔ کیا وہ مغربیت اسی حیات۔ اسی آرٹ۔ انہی تاثرات میں رنگے ہوئے نظر نہیں آتے۔ مگر وہ انقلاب وہ بغاوت وہ ترقی پسندی جس پر ہمیں مان ہے۔ کیا وہ ہماری تہذیب اور ہمارا رنگ ہے۔ یا وہی کچھ ہے۔ جو کسی آزاد ملک نے اپنے حصولِ حیات کے لئے کیا ہے . . . . (غلام جذباتِ زندگی تو کیا وقت کی مصلحت سے بھی ناواقف ہیں)

وہ دن دیکھنے کی تمنا کسے نہیں۔ کہ ترقی پسند۔ سرشار۔ پریم چند نذیر احمد۔ ماجد۔ شبلی۔ غالب۔ داغ اور اقبال جیسے بلند مرتبہ لوگ کہلائیں۔ اور اپنی تحریک کو پہلی تحریکوں سے۔ اور ان لوگوں سے جن کے نقشِ قدم پر ہم چلتے آئے ہیں۔ نئی اور کامیاب راہیں بنانے میں فتحمند ثابت ہوں۔ اگر ترقی پسندی کا مفہوم فرسودہ اور بے جان کرداروں سے دماغ میں ایک ہیجان اور زندگی پیدا کرنا ہے تو آج مولانا نذیر۔ سرشار اور پریم چند کے کئی افسانے بھی تو ترقی پسندی کے معیار پر پورا اتر سکتے ہیں۔ لیکن اعتماد سے کہا نہیں جا سکتا کہ کونسا نام سالِ رواں میں نظر آئے گا۔ اور کونسا نام خود ترقی پسند دفن کر کے اس کی قبر تک کا نام و نشان نہ بتائیں گے۔ اقبال اپنے دور کا پہلا اور آخری شاعرِ انقلاب اور ترقی پسند شاعر تھا۔ جس

نے مزدور کو جگایا۔ اس کی باوقار طرف داری کی صحیح راہ دکھلائی۔

مصنف کی عظمت کا اندازہ محض اس کے چاہنے والوں پر موقوف نہیں۔ بلکہ نظامِ جہاں پر موقوف ہے۔ جہاں ہم زندہ رہنے کا دعوےٰ کرتے ہیں + یہ یقینی امر ہے کہ حیاتِ تازہ۔ نظامِ نو مسرتوں کی موشگافیوں کے بوجھ سے دب نہیں سکتا۔ مگر اس وقت تک جب تک ہماری زبان اور ہمارے معاشرتی اصول جزِ نظام نہیں کہلاتے۔ اور یہ الحاق یہ اتحاد ہماری تمام جدتوں اور ترقی پسندیوں کو بہ حیثیتِ فن ہمیشہ کے لئے لازوال نہ بنا دے۔ میرے خیال میں یہ ہر ترقی پسندانہ تغیر اور قدامت کی اٹل قوتوں کا ردِ عمل ہے۔ جس میں رشک اور حسد دونوں ستیزہ کار ہیں۔ قدامت پسندانہ نفرت تہذیب کی بنیاد کو کھوکھلا بنا دینے کا خاکہ نہیں۔ بلکہ تہذیب میں جدت اور زندگی کے معیار کو اور بلند کرنے کی ایک سعی ہے۔ تاکہ انحطاط کی مہم اور

موہوم آرزوئیں قبول نہ کی جائیں۔ بلکہ اُن کے خلاف بغاوت اُٹھائی جائے۔ اور ویسی ہی بغاوت جیسی کہ خود وقت پر ہمارے پیش رو اماموں نے۔ ادیبوں نے۔ شاعروں اور فنکاروں نے اپنے فن اور ادب کی محبت میں اٹھائی تھی۔ اور جب انہوں نے تہذیب کے دل و دماغ پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ اور اپنے نظام اپنی تہذیب کے متعلق بڑھ چڑھ کر دعولے کئے تھے۔ اور ہم نے بھی ان کو اپنے دل کی گہرائیوں میں اپنی آنکھوں کی روشنی میں جگہ دی تھی۔ اس بات کو کون جھٹلا سکتا ہے۔ کہ ہماری قدیم تہذیب اور روایات نے اسوقت آج سے کہیں بڑھ چڑھ کر خلوص۔ عقیدت۔ سچائی اور ہمدردی سے نشو و نما پائی تھی۔

فرد ہی اگر افراد ہیں۔ اور افراد ہی نے اگر اپنا کھویا ہوا نظام کھوئی ہوئی عظمت، ہر ترقی اور بلندی حاصل کرنی ہے۔ تو ضروری ہے۔ کہ فرد کامل طور پر معاشرتی زندگی کی صلاحیت کا علمبردار ہو تاکہ ہر ترقی اور ترقی پسندی کا دباؤ اور طوفان انسانی تہذیب اور اخلاق کی جڑوں کو اکھاڑ کر ہماری دسترس سے دور نہ پھینک دے۔ پرانی خامیاں ہمارے شعوری نظام اور ارتقائے حیات اور قوت ارادی پر قابو پا سکتی ہیں۔ مگر اُن

کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے زندہ قوموں کی طرح جنگ لڑنی ہوگی ـــــ یعنی جدید ہتھیاروں سے خونریز جنگ گو وہ وسائل وہ طریق ہم مہیا نہ کرسکیں۔ مگر ذہنی جنگ پوری آزادی کے ساتھ سختی سے سخت نکتہ چینی سے لڑی جانی چاہیئے۔ کیونکہ ہماری غلامی چاہے وہ ذہنی ہو۔ یا معاشرتی۔ ہر حالت میں غلامی ہے۔

حقیقت نگاری یقیناً فن کی فتح ہے۔ مگر اُس حقیقت تک کہ جس سے بنی نوع انسان کی نجات کی راہیں کھلتی ہیں۔ ترقی پسند ادیب ابھی نہیں پہنچا - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - بیرونی اثرات نے ہماری زندگی میں وہ امتیازی انقلاب پیدا نہیں ہونے دیا۔ جو ایک قوم بننے کے لئے ضروری تھا۔ اور نہ بیرونی اثرات نے ہماری اقتصادی حالت کو بہتر بنایا ہے۔ ان اثرات سے شعوری اور جنسی کیفیات میں رنگارنگی ضرور پیدا ہوئی ہے۔ مگر ان سے ہماری نسلی تعلی بالکل ختم ہو رہی ہے۔ اور وہ تحریک جس نے ہمارے لباس شکل وصورت اور معاشرتی زندگی میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دی ہے ناقص اور خود بخود کھوکھلا ثابت ہو رہی ہے۔ اور ایسی تحریکیں ہمارے درمیان ہمیشہ ہی کھوکھلی اور بے کار رہیں گی۔ جب تک ہم نسلی امتیاز

سے ہٹ کر اپنے ملک کی صنعت۔ آرٹ اور ادب کی تعمیر از سرِ نو اُنہیں ضرورتوں کے مطابق استوار نہ کریں گے جو دوسری قوموں کو محسوس ہوتی رہی ہیں۔ یہ بہت بڑا صدمہ ہے۔ اور فطرتاً ہم یہ روحانی صدمہ برداشت نہیں کر سکتے اور بہت دیر تک اس زبوں حالت میں بھی نہیں رہ سکتے۔ جس میں سے گزر رہے ہیں

پہلے پہل لڑکیوں کو افسانے، رسالے اور عامیانہ کتابیں پڑھنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ بلکہ بڑی حد تک لڑکیوں کا پڑھنا ہی ایک عیب سمجھا جاتا تھا۔ سوائے چند مذہبی کتب کے جو الہامی اور آسمانی کتابوں کا درجہ رکھتی تھیں۔ آج لڑکیاں کھلم کھلا وہ لٹریچر پڑھتی ہیں۔ جن میں جنسی لذتوں کے انتشار کے علاوہ ان تجربات کا بھی ذکر آ جاتا ہے۔ جو لڑکیوں کو کبھی پیش نہ آئیں گے۔ چولی۔ آزار بند۔ کولہے۔ چھاتیاں اور بوسوں کا ذکر عام ہے۔ کبھی یہ نام کھلے طور پر لینا بے حیائی اور بے غیرتی سمجھی جاتی تھی۔ پہلے پہل شراب کی لذت اور اس کی کڑواہٹ ان لوگوں کی ملکیت تھی جو جاگیردارانہ زندگی کے مالک تھے۔ اور آج لوگ شراب پیتے ہیں سماج کی موت کے لئے۔ مزدور کی سلامتی کے لئے مزدور کو اُس کے حقوق دلانے کے لئے آج وہ گناہ کے مرتکب بدمستی اور عیش و

نشاط کے لئے نہیں ہوتے۔ ان کی طبیعتیں محض اپنے فکر۔ غم اور احساس کو ڈبو دینے کے لئے مچلتی ہیں کیونکہ اُن کے ہر گلاس پر لکھا رہتا ہے" ۔ آگے چل کر ابھی انہوں نے بڑے بڑے کام انجام دینے ہیں"۔ یہ ترقی پسندانہ ذہنی انقلاب نہیں تو اور کیا ہے۔

پہلے پہل تھیٹروں میں عورتوں اور ہیروئن کا پارٹ لڑکے ادا کرتے تھے۔ اُنہیں چولی سے لے کر پاؤں تک ہر زنانہ لباس بڑی چست وضع قطع کا زیب تن کرنا ہوتا تھا۔ اور اِن کی اداؤں پر مرد عورتیں جان دیتی تھیں۔ بڑی بڑی سنگ دل، طرحدار طوائفیں ماری ماری پھرتی تھیں۔ ان کی محبت کے افسانے چھپتے تھے کہتے ہیں نواب واجد علی بادشاہ اودھ کے زمانے میں مرد خود عورت کا پارٹ ادا کرتے تھے اور اب عورتیں عورتوں کا اور لڑکیاں ہیروئن کا پارٹ ادا کرتی ہیں۔ اور وہ ہیرو جو کبھی ہیروئن بنتے تھے۔ جن کے بدن میں لوچ ہوتی تھی۔ مرد عورتیں جن پر جان دیتی تھیں۔ آج سکرین پر فیل نچے نظر آتے ہیں۔ اور ان لڑکیوں سے بیاہے جاتے ہیں۔ جن کے عشاق ملک بھر میں لاکھوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اور وہ ہر روز ان کو حاصل کرنے کی بجائے ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے جانیں لڑا دیتے ہیں۔ اِس ٹکٹ کے لئے جس پر پہلے کبھی ٹیکس نہ ہوتا تھا

——— پہلے پہل بائیسکل کا ایک پہیہ بہت چھوٹا ہوتا تھا اور دوسرا بہت بڑا۔ اور آج بائیسکل کے دونوں پہیے برابر ہیں۔ رفتار بھی پہلے سے چار گنا تیز ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ کہ اگلا عورت ہے یا پچھلا ——— پہلے عورتوں کے سر پہ کپڑا ان کا تقدس تھا۔ اور آج وہی دوپٹہ گلے میں حسن بن کر چھاتیوں کے نہ ہوتے ہوئے ان کو ابھارنے میں مدد دیتا ہے۔ پہلے پہل ہر نوجوان کسی ریسٹورنٹ کو دور سے دیکھ کر للچا سے چٹخارے لیتا تھا اور میم صاحب کی بناوٹ، نزاکت اور اداؤں کا ذکر کر کے دل بہلاتا تھا۔ آج ہندوستانی لڑکیاں ہر شہرت یافتہ ریسٹورنٹ میں خوش وقتی کے لئے جاتی ہیں۔ شراب اور ناچ سے دل بہلاتی ہیں۔ اور اگر انہیں کبھی مغربی نما جسم سے ناچ ناچنے اور ساتھ بیٹھنے کا موقع ہاتھ آ جائے۔ تو وہ اپنے ماحول سے تنقید کرتی ہیں؟ ۔ پہلے چلنے والے دور سے کسی مغرب زدہ کو دیکھ کر پاس ادب سے پہلو بدل جاتے۔ اب شانوں سے شانے ملائے اور بس چلے تو ٹکرا کر چلتے ہیں۔

پہلے پہل عبادت مندروں اور مسجدوں میں جا کر ادا کی جاتی تھی۔ اور اب گھروں میں مندر اور مسجدیں بن گئی ہیں۔ اور

سب سے زیادہ دلچسپ بات جو دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ مغربیت اور مشرقیت کا تصادم ہے۔ پہلے پہل سوٹ بوٹ کا رواج زور پکڑتا گیا۔ عدالتوں۔ کالجوں۔ اسکولوں۔ دفتروں دوکانوں۔ کارخانوں سے نکل کر مزدور کو بھی اس کا حصہ ملا۔ اور اب دھوتی۔ کھدر ٹوپی۔ چست پاجامہ۔ اچکن۔ شلوار۔ شیروانی زیب تن ہو کر مشرقیت کا ماتم کر رہی ہیں۔۔ جدید آرٹ ہے۔ جدید شاعری سر چڑھ کر بول رہی ہے۔ ادب میں پیسہ۔ مزدور۔ ترقی پسندی اور پھر ترقی پسندی کے ساتھ غلامی۔ نجات اور اشترکیت ہے۔ بہت سے اشتراکی ادیب کہلانا ترقی پسندی کا حل سمجھتے ہیں۔

وہ جنہوں نے ترقی پسندی کا آغاز کیا تھا۔ لڑائیاں مول لی تھیں۔ کتابیں ضبط کروائی تھیں۔ اپنے مشاہدات کو دوسروں تک پہنچانے کا احساس کیا تھا۔ اس بات کا وہ اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ کہ انہیں اپنی کوشش کا ایک دن ایک نئی تحریک کی صورت میں مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اور جب ان کی کوشش تحریک کی صورت اختیار کریگی۔ تو ایک گروہ اس اشتراکیت کا علم بلند کر دے گا۔ جس کی بنیاد۔ شراب۔ جوا اور سوسائٹی

کی بد چلنیوں سے استوار ہوگی - اور وہ دُور بیٹھ کر سماج اور مزدور کی مٹی خراب کریں گے - اور سیاسی اور اقتصادی زندگی کو ادب کی آڑ میں اس طرح چھپا دیں گے - کہ حال اور مستقبل دونوں ہنستے رہیں گے -

---

جس طرح ایک مزدور کے ماضی اور حال حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں - اِسی طرح ایک فنکار ایک ادیب بھی ہر زمانے ہر دَور کی تلخ نوائی اور خوش کاریوں سے دوچار ہوتا ہے - اِن سطور میں ان چندِ تلخ حقیقتوں کا اظہار ہے - جن سے مجھے پہلے پہل دوچار ہونا پڑا —— گذشتہ جنگِ عظیم نئی نئی ختم ہوئی تھی موسم گرما کا زمانہ تھا - ۱۹۲۰ء کی گرمیاں بہت دلچسپ تھیں - ان دنوں مَیں بھی شملہ میں تھا - وہاں رکشا والے سے لے کر راجہ مہاراجہ نواب - انگریز اور مہا انگریز سبھی خوش تھے - وہ دلفریب فضا وہ دِن شاید شملہ پھر نہ دیکھ سکے - کیونکہ ہر آنے والا دن گزرے ہوئے کل سے بدتر نظر آتا ہے - گذشتہ جنگِ عظیم کا اختتام ہندوستان کے لئے بھی اُمیدیں ساتھ لایا تھا - اور شملہ عروسِ شب اور سیاسیات کا مرکز بن رہا تھا - اس امتیازِ رنگ و بو کے زبردست تصادم

کے درمیان آرٹسٹ اور شاعروں کے لئے بھی کچھ تسلی کا سامان مہیا
کیا گیا تھا۔ اور سوچا گیا تھا۔ ان کے دامن پر بھی دھبہ رہے اور
وہ بھی منہ پھاڑ پھاڑ کر یہ نہ کہہ سکیں۔ کہ انہیں جنگِ عظیم کے بعد
ملکی برکتوں میں کوئی حصہ نہیں ملا۔ ۱۹۲۰ء میں پہلی بار میں نے شملہ
کی نمائش میں حصہ لیا تھا۔ اور تصویریں نمائش کے لئے بھیجی تھیں۔
اور ان کو جو جگہ دی گئی تھی۔ وہ اُس کی مستحق تھیں یہ ایک اعلیحدہ
بات ہے۔ غالباً میں نے اور میرے عزیز دوستوں نے اس وقت
یہی محسوس کیا تھا کہ معیار کے مطابق میری تصویروں کے
ساتھ برتاؤ نہیں کیا گیا۔ لیکن میں ہر طرح مطمئن تھا۔ نمائش کے
دنوں کی بات ہے۔ رکشا والا رکشا سے زیادہ ناچتا نظر آرہا تھا اُسے
زور لگانا ہی پڑتا تھا۔ وہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ کیونکہ رکشا ہلکی
پھلکی ہونے کے باوجود دولت کے بوجھ سے ڈھلوان کی طرف
لڑھکتی جا رہی تھی۔ اور جوں جوں وہ دولت کے بوجھ سے دبی جا
رہی تھی۔ مجھے اتنا ہی اپنے آپ کو روک روک کر رکشا والے کے
ساتھ ساتھ سایہ کی مانند چلنا پڑتا تھا۔ رکشا والے کو مقررہ پیسے ملنے
تھے۔ اور بھاری بھرکم سواری رکشا والے سے پیسے طے کر کے
ہی اپنا بوجھ چھوڑے بیٹھی تھی۔ اور میں جیسے دنیا والوں نے پہلی

بار آرٹسٹ کہہ کر پکار رہا تھا۔ دولت کے چنگل میں گھرا ہوا دولت کے ساتھ ساتھ قدم اُٹھا رہا تھا۔ اور فیصلہ نہ کر سکتا تھا۔ کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ کہاں اور کیوں جانا ہے ——— ؟۔ رکشا والے کی ہڈیاں کبھی کبھی اس طرح کھنکھنا اُٹھتی تھیں۔ جیسے سیف SAFE میں پڑے ہوئے سکے اپنی جگہ سے سرکنے لگتے ہیں۔ رکشا والے کو جب ضرورت سے زیادہ زور لگانے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اور وہ ضرورت سے زیادہ ہانپنے لگتا تھا۔ تو رکشا کا بوجھ پکار اُٹھتا تھا۔ "چغتائی صاحب کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر آپ بھی رکشا لے لیتے !"۔ مجھے صبر اور جبر سے کام لیتے ہوئے چپ رہنا پڑتا تھا۔ کیونکہ عین اس وقت رکشا والا مجھے اس طرح نظر آتا تھا۔ جیسے وہ کوئی لاؤ و چوپایہ ہے۔ اور اس کی رکشا انسانی ذلت کی آخری شکل ہے ——— رکشا میں بیٹھی ہوئی سواری نے کئی بار بڑے طمطراق سے کہا تھا۔ یہ غریب لوگ بھی سال بھر ہمارے آنے کی اُمیدوں پر جیتے ہیں۔ اگر ہم شملہ نہ آئیں۔ اور ان کے حوصلے بلند نہ کریں۔ تو ان غریبوں کی لاشیں اور ہڈیاں شملہ میں نظر آئیں۔ یہ کہہ کر میرے

مداح نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا۔ اور کوشش کی۔ کہ میں اُن کی بلند خیالی کی داد دوں، میں خاموش رہا۔ اور خاموش اس لئے بھی۔ کہ وہ میری تصویریں خریدنے کا ایک چکّر چلائے ہوئے تھے ــــــــــ

رکشا والے سے ذرا تن کر اور فخریہ غصّے میں بولے۔ ذرا اور تیز چلاؤ پھر فوراً ہی مہربانی کے لہجہ میں بولے "قدم اُٹھاؤ بھئی۔ ہم نے چل کر چغتائی صاحب کو چاہے پلانی ہے۔" پہاڑی پگڈنڈیاں اور موڑ در موڑ اکثر دلچسپ ہوتے ہیں۔ رکشا والے نے موڑ کے قریب پہنچکر اپنے گھنگھروؤں کو ایک دلفریب لرزہ دیا۔ اُس وقت اس کی آواز واقعی رقت انگیز تھی۔ اور یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کسی دھن میں رکشا والے کے ہاتھ سے رکشا چھُوٹ گئی ہے۔ اور وہ پتھروں سے سر پھوڑتی ناہموار راستے پر خود بخود منزلِ مقصود کیطرف چلی جا رہی ہے۔ میں نے اُس وقت بغیر کسی ارادے کے رکشا والے سے پوچھا "بھئی یہ تو بتاؤ۔ یہ گھنگرو آخر تم بجاتے کیسے ہو۔ یہ بھی تو کوئی آرٹ ہے۔ اور ہر آرٹ خون پسینہ ایک کر کے حاصل ہوتا ہے۔" ــــــــ اُس نے کچھ نہ سُنا۔ کیونکہ اس وقت اس کا سانس پھول رہا تھا۔ اس کا خون پسینہ ایک ہو رہا تھا۔ اور وہ بلندی سے پستی کی طرف رُک رُک کر اور سنبھل سنبھل کر اپنے سوار کے بنگلے

تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا وہ پیسے جو اُس نے اپنی مزدوری کے ٹھہرائے تھے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ چاہے اُسے چلتے چلتے صبح سے شام ہی کیوں نہ ہو جاتی۔ چغتائی صاحب آج کی محفل بھی خوب تھی۔ مہمان بھی اچھے خاصے تھے اور حکومت کے نمائندے بھی۔ پھر انھوں نے میری طرف مڑ کر کہا۔ "میاں صاحب (میاں صاحب سے مراد میاں فضل حسین مرحوم) کی دوستی لالہ ہر کشن لال کے ساتھ کچھ بے جوڑ سی نظر آرہی ہے" میں چپ رہا کیونکہ یہ مسئلہ میری سمجھ سے بہت بلند تھا۔ وہ بولے آخر ان لوگوں کو آرٹ کا کچھ پتہ بھی ہے۔ ہم آپ کی تصویریں خریدیں گے۔ میری بہو تو آپ کی شیدائی ہے۔ پھر اُس نے اس سکھ بزرگ کا ذکر چھیڑ دیا۔ جس نے میرے اعزاز میں ایک مختصر سی پارٹی دی تھی۔ بھائی ویر سنگھ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ اور پھر خود ہی میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بول اُٹھے۔ یہ شاعر لوگ بھی خوب ہوتے ہیں۔ اقبال نے ترانہ بھی کیا خوب لکھا ہے۔ پھر کچھ سوچ میں ڈوب گئے۔ جیسے ہندستان کا دوسرا نام سونا ہے۔ واقعی ہندستاں کے برابر دوسرا کوئی ملک نہیں۔ بولے۔ یہ فتح بھی تو ہندستان کی فتح ہے۔ لڑائی شروع ہوئے ڈاکٹر صاحب کو

بھی چائے پر بلائیں گے۔ شاعروں اور آرٹسٹوں سے ملنا ایک قومی فرض ہی تو ہے۔ آپ کا وقت بھی خوب کٹتا ہوگا۔ ان تصویروں کے بنانے میں ہم آپ کی بنی ہوئی ایک تصویر اپنے ڈرائنگ روم کے لئے ضرور خرید کریں گے۔ میری بہو تو آپ کی بڑی مدّاح ہے بڑے بڑے لوگ آتے رہتے ہیں ہمارے ہاں۔ آپ کے لئے بہت بہتر ہوگا۔ کہ آپ کی ایک تصویر ہمارے ڈرائنگ روم میں موجود رہے۔ آخر یہ تصویریں آپ بناتے کس مصالحہ سے ہیں۔ جب پہلے پہل میں نے اپنے قدردان کی زبانی مصالحہ کا لفظ سنا۔ تو مجھے یوں معلوم دینے لگا۔ جیسے اپنے محسن "کنوشیر" کی رکشا میں خود چلا رہا ہوں۔ اور رکشا والا قہقہے لگا رہا ہے۔ اب رکشا والا اپنے مخصوص انداز میں گھنگرو بجانے لگا۔ میں انکے بنگلہ کے سامنے کھڑا تھا۔ اور ان کا ایک ملازم ان کو رکشا سے اتارنے لگا۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر انہوں نے ذرا بے تکلفی سے اپنی محترمہ بہو کو آواز دی۔ وہ بال کھولے جیسے ان کو خشک کرنے کی غرض سے کندھوں پر ڈال رکھے ہوں برآمد ہوئی۔ وہ خوشی خوشی اپنا ڈرائنگ روم مجھے دکھلاتی رہی۔ اور یہ یقین دلاتی رہی۔ کہ اُسے چغتائی کی ایک تصویر ضرور خرید کرنی ہے۔ یہ بمبئی کا واقعہ

ہے۔ اور آج اکیس سال گزر جانے کے بعد، بہو کو اور ان کے خسر کو میری کوئی تصویر قابلِ انتخاب نظر نہیں آئی۔ برعکس اس کے مرحوم لالہ ہرکشن لال جن کو وہ کور ذوق اور تجارتی آدمی بتلاتے تھے ہزاروں روپے سے میری اور دوسرے آرٹسٹوں کی تصاویر خرید کر کے اپنے ذوق اور ہندستانی آرٹ سے ہمدردی کا ثبوت بہم پہنچا چکے تھے۔ انہیں دنوں ایک دفعہ مرحوم میاں سر فضل حسین نے مجھے ایک مختصر سے خط کے ذریعے ہدایت دی۔ کہ میں فلاں جگہ فلاں عورت کو جا کر ملوں۔ یہ عورت عمر میں مجھ سے کچھ بڑی۔ بہت زیادہ پڑھی لکھی۔ حسین اور دولت مند تھی۔ اس نے زندگی کے وہ تمام مراحل طے کئے تھے۔ جو آج کی عورت نے اتنی آزادانہ زندگی اور ان گنت وسائل حاصل ہونے پر بھی نہیں کئے یقیناً وہ زمانہ میرے آرٹ کا زمانہ تھا۔ اور میں بیتاب تھا۔ کہ میں آرٹسٹ بنوں۔ اور دنیا مجھے سمجھے۔ جب مرحوم میاں صاحب کا خط لے کر اس بہار آفریں حسینہ کے بنگلہ کے پاس جا کر ٹھہرا تو میں پسینہ میں شرابور ہو رہا تھا۔ کچھ ان بنگلوں پر پہنچنے کے لئے راستے کٹھن۔ دل آزردہ پھر یہ ہچکچاہٹ بھی تھی۔ کہ ان کے مکینوں کو بلاؤں تو کیسے بلاؤں۔ میں سوچ ہی رہا تھا۔ کہ

ایک ملازم میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ اور میری طرف اس طرح ہاتھ بڑھایا۔ جیسے وہ ہدایت نامہ مجھ سے مانگ رہا ہے۔ جو مرحوم میاں صاحب نے میرے لئے لکھا تھا۔ مَیں نے اپنی کم علمی اور گھبراہٹ میں وہ خط نکال کر اُسے دے دیا۔ اور وہ اندر لے گیا۔ نہایت متانت اور پُرخلوص انداز میں ایک عورت برآمدے میں داخل ہوئی۔ اور نہایت تپاک سے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے مجھے اندر لے گئی۔ اُس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور مَیں ابھی پوری طرح سے بیٹھ بھی نہ سکا تھا۔ کہ اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ چاہئے تو یہ تھا۔ مَیں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتی۔ اور ملاقات کا فخر حاصل کرتی۔ آپ کا قیام کہاں ہے۔ پہلے مَیں نے اپنے آپ پر نگاہ ڈالی۔ اور پھر اپنے پس منظر میں مجھے اپنی قیام گاہ دکھائی دی۔ ان دنوں مَیں اپنے عزیز دوست ماسٹر محمد حسین قادری (جو آجکل میو سکول آف آرٹ کے پرنسپل ہیں) کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ ایک کوارٹر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

جہاں پنجاب گورنمنٹ پریس کے کچھ پریس مَین کچھ کمپوزیٹر اور کلرک رہتے تھے۔ یہ تھا ماحول جہاں ہمیں شملہ میں گرمیاں کاٹنے کا موقع ملا تھا اور وہ جن کے پاس ہم رہتے تھے۔ بڑے بردبار اور دفتری

سیاسیات کے ماہر تھے۔ وہ دفتر سے واپس آکر اور دفتر جانے تک ہر روز کلرکوں کے گریڈ کے متعلق ایک مفصّل بحث کیا کرتے تھے اور جو کچھ انکو ملتا تھا۔ اسے اپنی قابلیت کے مقابلہ میں بہت کم خیال کرتے تھے۔ نکتہ چینی اور عیب جوئی میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ اور بعض اوقات اِن کی بحث اتنی طول پکڑ جاتی تھی۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ ان کا ہیڈ کلرک ریٹائر ہو کر چلا گیا ہے۔ اور ان کے حقوق پر زبردست حملے ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ہمیں ہر لمحہ ان کی قابلیّت کی داد دینی پڑتی تھی۔ اور ان کی کامیابی کی دُعا مانگنی پڑتی تھی۔ وہ تمام لوگ وہ جگہ اس پس منظر میں نظر آرہے تھے معہ اپنے دوست ماسٹر محمد حسین قادری کے جن کی طفیل وہ جگہ وُہ آرام وہ ماحول حاصل تھا ــــ اور سامنے میرے وہ جدید ترحسینہ بیٹھی تھی۔ جس کے ہاتھ میں میرے نام کا خط تھا۔

اس وقت میرا حلیہ یہ تھا۔ سر پر ایک سیاہ افغاں کیپ اور پٹھانوں کی سی شلوار۔ اور موچھیں بڑی بڑی جاگیرداروں کی طرح اور بوٹ اتنی لمبی مسافت کے سبب لت پت ہو رہے تھے۔ جن کے نیچے ایک ایرانی قالین اپنے ڈیزائن کی بہار دکھا رہا تھا۔ اور مجھے رہ رہ کر خیال آتا تھا۔ کہ وہ کہیں قالین کی تعریف نہ شروع کر

دے ۔ اُس کی ساڑھی کا رنگ زمردی سا تھا ۔ اور اس کے جسم پر نہایت موزوں نظر آتا تھا ۔ اور پھر کشش بھی کشش کے ساتھ اس کا خلوص حد سے بڑھتا چلا جا رہا تھا ۔ تھی وہ بھی پنجابن ۔ لیکن بال اُس نے بنگالنوں کی طرح بنا رکھے تھے ۔ چہرے پر ذہانت جلد میں لطافت اور قد میں رعنائی تھی ۔ اُٹھ کر اِدھر اُدھر جاتی ۔ تو کولہے اس طرح ہلتے تھے ۔ جیسے اُس نے اُن کو مٹکانے کا امتحان پاس کر رکھا ہے ۔ میرا دِل چاہتا ۔ کہ مَیں اُسے نہ دیکھوں ۔ تو وہ خود ہی اپنا آپ دکھانے سے باز نہ رہ سکتی ۔ لب اس کے سُرخ ضرور تھے ۔ لیکن ناخن آجکل کی نقال استریوں کی طرح نہ تھے ۔ سُرخ اور اتنے سُرخ جیسے پنجے خون سے رنگے ہوں ۔ لیکن پھر بھی اس کے ناخنوں میں ایک نفاست اور ایک چمک ضرور تھی ۔ جمپر کی جگہ اس نے ایک نہایت خوبصورت بناوٹ کی پوستین پہن رکھی تھی ۔ اور وہ اس میں بہت بھلی معلوم دے رہی تھی ۔ آج مَیں اُس کا اور اس کی شکل وصورت کا اگر تصور کروں ۔ تو احساس ہوتا ہے ۔ کہ اگر وہ اُس وقت کہہ دیتی ۔ آپ کو مسٹر چغتائی آرٹسٹ نے بھیجا ہے ۔ تو وہ یقیناً حق بجانب ہوتی ۔ اور میرا کیا حشر ہوتا ۔ یہ مَیں نہیں کہہ سکتا ـــــ اُس نے اپنے کمرے میں لے جا کر مجھے بٹھا دیا تھا ۔

اور خود کسی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اور یہی احساس ہوتا تھا جب وہ اِدھر اُدھر جاتی ہے۔ تو شیشوں میں سے میری حرکات کا معائنہ کرتی رہتی ہے۔ مَیں بہت کم ہلتا تھا۔ اِدھر اُدھر نہ دیکھتا تھا۔ اور یوں بیٹھا تھا۔ جیسے کسی ارضی دیوتا کے حضور میں بیٹھا ہوا پجاری نجات کی تمام دعاؤں کو بھول گیا ہو۔ جب چائے کا سامان آ چکا اور وہ اطمینان سے میرے سامنے جم کر بیٹھ گئی۔ تو اُس نے اپنے پہلو کو اُٹھاتے ہوئے کہا۔ مجھے آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا میاں صاحب نے نہایت مہربانی فرمائی۔ جو مجھے آپ سے ملنے کا موقعہ دیا۔ "آرٹسٹ کے ساتھ ملاقات صحیح معنوں میں اس کی تصویریں دیکھنے سے ہوتی ہے۔" مَیں نے دبی زبان سے کہا۔ اور اس وقت میں نے اس کے چہرے کا جائزہ جی بھر کر لیا تھا۔ وہ بہت خوش خوش نظر آتی تھی۔ اور اُسے میرے لباس پر میری شکل و صورت پر تنقید کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ یہ مَیں نے اندازہ کیا تھا۔ یہ کیوں شاید وہ مجھ سے زیادہ میری تصویروں کو اچھا سمجھتی تھی ——

کیوں جی۔ تصویریں ہی تو جذبات کی آئینہ دار ہیں —— جو نہ آپ کی طرح ساڑھیاں پہنتی ہیں۔ اور نہ میری طرح شلوار۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور کچھ سرک گئی۔ جیسے اُس نے میرے الفاظ کی جی

بھر کر داد دی ہے۔ اس وقت میری عمر اکیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ مجھ سے عمر میں بڑی ضرور تھی۔ اور شگفتہ اور زندہ دل بھی اس کا آرٹ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اُسے بہت سے مصنفین اور کتابوں کے نام یاد تھے۔ گفتگو کو اور زیادہ طول دیتے ہوئے اور شگفتگی پیدا کرتے ہوئے۔ وہ چائے اور کھانے کی دوسری چیزیں پیش کرتی رہی۔ اس نے نہایت شاعرانہ انداز میں کہا۔ تصویریں بناتے وقت آپ کا تصور بہت دُور دُور گھومتا ہوگا۔ "آپ کا مطلب حسین وجمیل عورتوں سے ہے" میں نے کہا۔ وہ اس طرح خوش خوش نظر آئی۔ جس طرح عورتیں اپنی تعریف سن کر نظر آتی ہیں۔ مگر میرے سوال کا جواب —— آپ نے جتنی میری تصویریں دیکھی ہیں۔ اُن میں آپ کو اپنی کوئی تصویر نظر آتی ہے۔ کاش میں ایسی ہوتی نہ معلوم آپ کیوں کر ایسی ایسی عمدہ تصاویر بناتے ہیں۔ اس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ بدن میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔ اور میرا چہرہ غور سے دیکھنے لگی جس پر تصویریں بنانے کی کوئی تمنا نظر نہ آتی تھی۔ میں ہمیشہ ہی آپ کے آرٹ اور آپ کی زندگی کے لئے پرارتھنا کرتی رہوں گی۔ اور منتظر رہوں گی کہ آپ کو اس سے بھی بلند مقام پر دیکھوں۔ اس کا دل کنول کی طرح کھلا تھا۔ وہ شام مجھے کبھی

نہ بھولے گی - اور نہ وہ مختصر سی محبت کبھی فراموش کر سکوں گا۔
اس نے اپنے برتاؤ سے افغان کیپ - پٹھانوں کی سی شلوار۔
قراق کوٹ - لتھ پتھ بوٹ - ملک لوگوں کی سی - مونچھیں کبھی
پر بھی تو توجہ نہ دی تھی - اور ایک ایسا جذبہ پیدا کر دیا تھا جس
کی گرماہٹ سے ہمیشہ تصویریں پیدا ہوتی رہیں - جب وہ مجھے
رخصت کرنے کے لیے برآمدہ میں کھڑی تھی - اس کے ہاتھ میں
ایک پیکٹ تھا - اور وہ مجھے گہرے احساس سے کہہ رہی تھی -
ہم لوگ ایک چھوڑ کئی تصویریں اپنے بنگلے کے لئے خرید کریں
گے - میں نے کہا - آپ تصویریں بنگلے کے لئے خرید کریں گے
نہ کہ اپنے لئے - اس کے چہرے پر شبنم کی سی نمی نمودار ہوئی -
پھر معاً وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی - اس واقعہ کے کئی سال بعد وہ
مجھے ملی - پھر ملی - اس وقت اس کا پتی مر چکا تھا - اور خود اس تصویر
کی مانند نظر آ رہی تھی - جس پر یاس ہی یاس برس رہی ہو ــــ

یہاں ان واقعات کا ذکر بھی خالی از لطف نہ ہوگا - جو حال ہی
میں پیش آئے ہیں - حالانکہ ان کا سلسلہ گذشتہ کئی سال سے چل
رہا تھا - میرے ایک کرم فرما ہیں - یورپ جاتے ہوئے
وہ میرے ہم سفر بھی رہ چکے ہیں - خود لاتعداد فرموں کے مالک

ہیں۔ ہزاروں نہیں کروڑوں کی آمدنی ہے۔ والدکے سر ہیں۔ آپ والد کے لاڈلے اور بڑے منظورِ نظر ہیں کئی سال سے اُن کی اور ان کی بیگم کی خواہش تھی۔ کہ وہ میری چند تصاویر خرید کریں۔ جہاں تک تصاویر کی خرید و فروخت کا سوال ہے۔ مَیں نے کبھی خواہش نہیں کی۔ کہ فلاں نمائش میں میری تصاویر فروخت ہوں یا مجھے کوئی انعام ملے۔ یا کوئی رئیس یا راجہ رانی میری تصاویر خرید کرے۔ چنانچہ اُسی دیرینہ بے نیازی کی بنا پر مَیں ان میاں بیوی کو بھی کئی سال تک یہ کہہ کر ٹالتا رہا۔ کہ تصویریں بنانے کا وقت نہیں ملتا۔ جب بناؤں گا۔ ضرور حاضر کردوں گا۔ حالانکہ میرے پاس سینکڑوں تصویریں موجود ہیں جو مَیں نے خود ملک اور قوم کی ملکیت سمجھ کر ایک میوزم میں لگانے کی خاطر بچا رکھی ہیں۔ آرٹسٹ اور ادیبوں کو جو کچھ قدرت سے ودلیعت ہوتا ہے۔ وہ ملک اور قوم کی ملکیت ہی تو ہوتا ہے۔ تاہم ان میاں بیوی نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ جس کی مجھے دلی قدر ہے۔ انجام کار انہوں نے ایک اور آرٹسٹ کو بیچ میں ڈالا۔ اور اُسے اس بات پر آمادہ کیا۔ کہ وہ ان کے لئے چغتائی کی چند تصاویر انتخاب کرے۔ چنانچہ اس آرٹسٹ نے مجھے نہیں میرے چھوٹے بھائی کو اس بات پر آمادہ کیا۔ کہ وہ

اُن کی خاطر چند تصاویر مجھ سے بالا بالا دے۔ مگر آرٹسٹ کو تصویریں دیتے وقت میرے بھائی نے کہا تھا۔ جن کے لئے آپ تصویریں انتخاب کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ ہزار دو ہزار نہیں۔ لاکھوں روپے گورنمنٹ کو ٹیکس کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔ ان کی آمدنی کا تو ٹھکانہ ہی نہیں مگر میں جانتا ہوں۔ وہ کوئی تصویر خرید نہیں کریں گے۔ یہ محض آپ کی خاطر ہے۔ ان کو تو چاہئے۔ ملک کی انڈسٹری ملک کے آرٹ کو Encourage کرنے کے لئے Blank چیک جاری کریں۔ ان کے لئے ہزار دو ہزار کی تصویر کی قیمت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ کئی سال گزرنے کے بعد میرے بھائی نے مجھے بتلایا ہے۔ کہ جو تصویریں انہوں نے آرٹسٹ کے ذریعے انتخاب کی تھیں۔ وہ کوئی لاکھ دو لاکھ کی نہ تھیں اُس کی مجموعی قیمت معمولی بہت معمولی ہزار، دو ہزار کے لگ بھگ تھی۔ مگر میاں بیوی نے اپنی بے نیازی سے اس بچارے آرٹسٹ کو یہ کہہ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے دولت کدہ سے ٹال دیا۔ کہ آجکل جنگ کا زمانہ ہے۔ آمدنی کم ہے۔ پھر کبھی دیکھا جائے گا ان کے ایک اور پیرو کار بیرسٹر صاحب کا ذکر ہے۔ وہ صاحب اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ ان کا باپ ہزاروں نہیں

کروڑوں کا مالک ہے۔ جسے سر کا خطاب حاصل ہے۔ کئی لاکھ روپیہ ٹیکس کی صورت میں ادا ہوتا ہے۔ انہوں نے بھی کئی سال تک اس بات کی خواہش کی۔ کہ وہ چغتائی آرٹسٹ کی چند تصاویر اپنے اکال گرہ کے لئے خرید کریں۔ تاکہ ملک کے آرٹسٹ کو کچھ مالی فائدہ پہنچے۔ یہاں بھی وہی بے نیازی کئی سال تک کارفرما رہی۔ آخرکار بیرسٹر صاحب نے بھی ایک اور بیرسٹر کو جو میرے ایک محترم بزرگ کے صاحبزادے ہیں۔ اس بات پر آمادہ کیا۔ کہ میں ان کو اپنی چند تصاویر دکھاؤں۔ میں نے اپنے کرم فرما کی بات نہ ٹالتے ہوئے تصویریں تو ضرور دکھلا دی تھیں لیکن خرید و فروخت کے متعلق بات کرنے کی جرأت ان کو یا بیرسٹر صاحب کو میرے سامنے نہیں ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے بھی میرے چھوٹے بھائی سے کچھ سمجھوتہ کیا۔ دوبارہ تصاویر دکھائیں۔ تو فریم کا تقاضا ہوا۔ کیونکہ ان کے پاپا ایک دو روز میں دہلی سے آنے والے تھے۔ انہوں نے بھی انتخاب میں حصہ لینا تھا۔ کہ کون کونسی تصویر خرید کی جائے۔ میرے بھائی نے کہا کیونکہ آپکے پاپا صاحب نے تصاویر کا انتخاب کرنا ہے۔ اس لئے آپ کا کیا خیال ہے اگر ان کو سنہری فریم کروا دیا جائے۔ بیرسٹر صاحب نے

نہایت دانشمندانہ طریق سے سر کو ہلاتے ہوئے کہا۔ ہاں ہاں سنہری فریم ٹھیک رہیں گے۔ آپ عموماً اپنی تصاویر کو جو سیاہ فریم لگاتے ہیں، وہ کچھ موزوں نہیں ہوتے۔ چنانچہ میرا بھائی سنہری فریم کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اور بیرسٹر صاحب تصاویر کی انتظار میں ۔

عرصے کی بات ہے۔ مَیں حسب معمول گھر کی بالائی منزل پر اپنے کام میں مصروف تھا۔ کہ میری گلی کا ایک چھوٹا لڑکا اوپر آیا۔ اُس نے کہا۔ کوئی عورت آپ سے ملنا چاہتی ہے ۔ اور نیچے کھڑی ہے۔ میرے دل میں خیال آیا۔ اس کو کسی طرح ٹرخا دیا جائے ۔ اور کہہ دیا جائے۔ کہ چغتائی صاحب ابھی ابھی باہر گئے ہیں لیکن پھر کچھ خیال کر کے اور عورت کا پاس کر کے اس لڑکے سے کہا ۔ چابی لے اور اسے بٹھلا۔ مَیں ابھی آتا ہوں۔ لڑکے کو چابی دے کر مَیں خود اس پانی سے شیو کرنے بیٹھ گیا۔ جو مَیں رنگ کرنے کے لئے استعمال کر رہا تھا سمجھتا تھا۔ بیچاری انتظار کرتے کرتے تنگ آگئی ہوگی۔ مگر رسمی آداب و سلام کے بعد جو سب سے پہلے بات اس نے کی ۔ وہ یہ تھی ۔ کہ مَیں معافی کی خواستگار ہوں۔ کہ آپ کے کام میں حارج ہوئی ۔ مَیں نے کہا۔ نہیں نہیں کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ کو بہت انتظار کرنا پڑا ۔ وہ بولی:۔

آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔ مختصر عرض ہے۔ کہ مَیں آج سے سال بھر پہلے خود طالب علم تھی۔ اب لاہور سے دُور فلاں شہر میں معلمہ ہوں۔ میری دیرینہ خواہش تھی۔ کہ میں آپ کی تصاویر دیکھوں۔ آپ کو دیکھوں۔ سو آج خوش قسمتی سے یہ آرزو پوری ہوئی کہ آپ کو دیکھا۔ اب کیا ممکن ہے۔ کہ آپ کی تصاویر کو بھی دیکھ سکوں یوں تو چھپی ہوئی مَیں نے بہت سی دیکھی ہیں۔ اس کے ذوق اور شوق سے متاثر ہو کر مَیں نے اُسے چند تصاویر دکھائیں۔ وہ بہت دیر تک ہر تصویر کو دیکھتی تھی۔ سوال کرتی تھی۔ اور پھر رکھ دیتی تھی۔ آرٹ کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ ان سے بھی ہزار درجہ اچھا سمجھتی تھی۔ جو محض چند کتب کا مطالعہ کر لینے کے بعد آرٹ و آرٹسٹ اور تصاویر کے متعلق باتیں بنایا کرتے ہیں۔ اور دنیا انہیں آرٹ اور فن کا نقاد سمجھتی ہے۔ تصاویر دیکھ چکنے کے بعد اس نے ڈرتے ڈرتے اور کانپتے کانپتے اپنا سیاہ بٹوا میرے آگے رکھ دیا اور کہا۔ مَیں سال بھر سے یہ پونجی جمع کرتی رہی ہوں۔ آپ جانتے ہیں ہم ہماری معلماؤں کی تنخواہ ہی کتنی ہوتی ہے۔ اور پھر اس پر فی زمانہ اخراجات بھی کس قدر بڑھے ہوئے ہیں۔ تاہم یہ سال بھر کی بچت کا نتیجہ ہے۔ مَیں اور بھی جب تک آپ کہیں گے

بھیجتی رہوں گی۔ صرف یہ چاہتی ہوں۔ کہ آپ اپنا کوئی شاہکار نہیں۔ کوئی معمولی خاکہ ہی ہو۔ مجھے عنایت فرمائیں۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ مجھے آپ سے پوری پوری توقع ہے۔ آپ دل نہیں توڑیں گے۔ کیونکہ آپ خود صنف لطیف کو تصویر کا لباس پہناتے ہیں۔ اس لئے ضرور کوئی نہ کوئی خاکہ جو آپ نے ردی کر کے پھینک دیا ہو۔ مجھے عنایت کرینگے میں اسے اپنے گھر کی زینت بنانا چاہتی ہوں۔ میرا ایک بھائی ہے۔ ماں ہے، باپ مدت ہوئی مر چکا ہے۔ میں نے اُس کا پرس اسے واپس کر دیا۔ اور ساتھ ہی اس کے ایک نوجوان خوبصورت لڑکی ہونے کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ ایک پرکھ والی اور مخلص انسان ہونے کی وجہ سے ایک شاندار تصویر جسے میں خود بہترین سمجھتا تھا فریم کروا کر نذر کی۔ خدا جانے وہ لڑکی زندہ ہے۔ یا مر چکی ہے ابھی کنواری ہے۔ یا ماں بن چکی ہے۔ اگر زندہ ہے۔ تو ضرور ہے۔ کہ وہ تصویر اس کے گھر کی زینت ہو گی۔ اس کے دیکھنے سے اس کو ایک غیر فانی خوشی حاصل ہوتی ہو گی۔ اور اگر مر چکی ہے۔ تو پھر بھی اس کی روح اس بات سے خوش و خرم ہو گی کہ ایک آرٹسٹ نے اس کی روح کی پاکیزگی کی قدر کرتے ہوئے

اُس کی خوشی کی خاطر اُس کی بات کو رد نہیں کیا تھا۔
ہمارے ہاں آرٹ تو ہے۔ مگر آرٹسٹ کے وسائل اتنے نہیں۔ کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر اپنی سلامتی کا یقین دِلا سکے۔ اور زندگی کی تشکیلِ نو کیلئے ہر اندیشہ سے جا ٹکرائے ہمارے جدید آرٹ کا ادب کا صرف ایک مسلک ہو سکتا ہے۔ کہ وہ فن برائے فن کے لئے زندہ رہے۔ جس میں نہ اقتصادی تنگیوں کا رونا ہو۔ نہ سرمایہ دار کی غفلت شعاریوں کی شکایت ——— جینا آرٹ کے لئے جینا اور ہر قیمت پر جینا آرٹسٹ کا فرض اور فرضِ زندگی ہے۔ کاش ہمارا فن برائے زندگی ہوتا۔ اور زندگی سے حاصل ہوتا۔ نہ کہ وہ ذہنی کوفت سے بنگلوں میں رہنے والوں کی منافقت کا شکار ہو جاتا اور اسے کوئی اتنا بھی نہ پوچھتا۔ آخر خسر نے بہو سے اور بہو نے خسر سے کیا کہا تھا۔ پھر پتنی نے پتی سے اور پتی نے پتنی سے بسترِ مرگ تک کس طرح آرٹ اور آرٹسٹ کو زندہ رکھنے کی تلقین کی تھی۔ وہ لوگ کتنے مبارک اور اہلِ نظر ہیں۔ جو فن اور فنکار کا احترام کرتے ہیں۔ اور چند روپے خرچ کر کے کہتے ہیں۔ آرٹ ہماری تہذیب اور حیات کا جزو ہے۔

ابتدا میں مجھے ایک کام کے سلسلے میں کلکتہ جانا پڑا۔ تو مجھے احساس ہوا۔ کہ بنگال کے اُن چند آرٹسٹوں کو ملنا چاہیئے۔ جو جدید آرٹ کے سلسلے میں بڑی بڑی خدمتیں انجام دے رہے ہیں۔ جس آدمی کے پاس میں ٹھہرا تھا۔ وہ آرٹ سے کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ لیکن آرٹ سرکل سے اس کا کچھ واسطہ ضرور تھا۔ وہ جدید آرٹ اور آرٹسٹوں کے سخت خلاف تھا۔ اُسے یہ کہنا کہ میں آرٹسٹ ہوں۔ اپنا دشمن بنانا تھا —— میں جوں جوں وقت پاتا تھا۔ مختلف آرٹسٹوں کو ملتا تھا۔ اور ان سے تبادلہ خیالات کرتا تھا۔ لیکن یہ کبھی بیان نہیں کرتا تھا۔ کہ میں چغتائی آرٹسٹ ہوں۔ اگر کوئی بنگالی آرٹسٹ میری شلوار میری ٹوپی میرا فراک کوٹ دیکھ کر پنجابی سمجھتا تھا۔ اور کچھ چغتائی کے متعلق پوچھتا تھا۔ تو چغتائی سر ہلا کر یہ کہتا تھا۔ ہاں ہاں میں اس کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہمارے شہر ہی کا ہے۔ میرے اُسی قیام کے دوران میں آرٹ سکول لاہور کا وائس پرنسپل کلکتہ آنکلا۔ اور وہ مرحوم آرٹسٹ استاد حسین بخش کے پاس ٹھہرا۔ اس کے دل میں ایک آرزو ولولے لے رہی تھی۔ کہ وہ جدید آرٹ کے بانی ڈاکٹر ابندرا ناتھ ٹیگور کو ملے۔ مرحوم وائس پرنسپل آرٹ سکول لاہور

مرحوم استاد حسین بخش آرٹسٹ میڈن تھیٹر اور ان کے چند
شاگرد مل کر ڈاکٹر ٹیگور کو ملنے جا رہے تھے۔ کہ انہوں نے
زبردستی مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ چلنے سے پہلے مجھے ضرور محسوس
ہوا تھا۔ کہیں وہاں یہ لوگ مجھے نشر نہ کریں۔ ٹیگور کا گھر ان دنوں
ایک محل کی صورت تھا۔ ان کا بھائی گوگیندر ناتھ ٹیگور اور چند
شاگرد وہاں موجود تھے۔ ٹیگور نے وائس پرنسپل صاحب سے
ملاقات کرنے کے بعد جو پہلا سوال کیا۔ وہ چغتائی سے متعلق تھا
میرے کرم فرما نے اپنی جلد بازی سے کام لے کر فوراً میری طرف
اشارہ کر دیا۔ ڈاکٹر ٹیگور اور ان کے بھائی گگن بابو نے اٹھ کر
مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اور کہا Son of The Kabliwala آج میں
محسوس کرتا ہوں۔ کلکتہ جیسے شہر میں میرا اس لباس میں بے دھڑک
پھرنا کافی سے زیادہ یا تو جرأت تھی یا حماقت۔ . . جب ہم
لوگ ان بنگالی آرٹسٹوں سے مل کر واپس لوٹے۔ تو وائس پرنسپل
آرٹ اسکول لاہور نے اپنی ذہانت کا اظہار کرتے ہوئے اور اس
ماحول سے متاثر ہوتے ہوئے جس سے اس گھرانے کی شان
امارت ظاہر تھی۔ کہا۔ عبدالرحمٰن، اگر تم آرٹ شروع کرنے سے
پہلے اس بڑے درخت کے سائے تلے اُگتے۔ تو اس کی چھاؤں

تجھے پروان چڑھنے سے پہلے ہی مرجھا کر رکھ دیتی۔ اس وقت طبیعت میں اٹھان زیادہ تھی۔ کچھ نڈرپن بھی تھا۔ چنانچہ میں نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ جن کو پروان چڑھنا ہوتا ہے۔ وہ پتھروں میں سے بھی پھوٹ نکلتے ہیں ——— اور پھر ۱۹۲۴ء میں جب لنڈن میں ومبلے کی نمائش ہونا قرار پائی۔ تو میرے آرٹ نے ہندستان کی ساری فضا میں ایک گونج پیدا کر دی تھی۔ چغتائی بنگالی آرٹ سے اتنا ہی مختلف واقع ہوا تھا۔ جتنا کہ وہ اجنٹا کے قریب واقع ہوئے ہیں۔ یہ تھا وہ ماحول اور یہ تھا۔ وہ زمانہ جب میں رکشا اور رکشا والے کی طرح بغیر اونچ نیچ سوچے بغیر نشیب و فراز دیکھتے بڑھتا گیا۔ اور خسر۔ بہو۔ پتی اور پتنی کی کوئی پروا نہ کرتا ہوا بڑھتا گیا۔ کیونکہ آخر یہ کھیل آرٹسٹوں کے ساتھ ہمیشہ سے کھیلے جاتے رہے ہیں۔ اور شاید کسی کامیاب آرٹسٹ کے لئے یہی کامیابی کا راز ہو۔ اور شاید ان اندھا دھند کوششوں کے نام ہی . . . . فن برائے فن ہو۔

آرٹسٹ کے ختم ہو جانے سے آرٹ ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ آرٹسٹ کے نقش اس کے بعد زیادہ پختہ اور زیادہ روشن نظر آنے لگتے ہیں۔ اور ایک آرٹسٹ کی ذاتی ملکیت۔ قوم اور ملک کی ملکیت

بن جاتی ہے۔ اور ایک صحیح قسم کا آرٹسٹ ہر معمولی سے معمولی شہری کا بھی محبوب ترین محبوب بن جاتا ہے۔ میں پہلے پہل کیا تھا۔ اور آج کیا ہوں۔ یہ میں جانتا ہوں۔"

چغتائی
مارچ ۱۹۴۱ء

چناب

وہ شام مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ جب وہ اور میں چناب کے کنارے بیٹھے شعاعوں سے کھیل رہے تھے اور شعاعیں لہروں میں ملی جلی مضطرب، ایک دوسرے سے گلوگیر ہو رہی تھیں۔

چناب کا پانی خود کبھی کوئی کروٹ نہیں بدلتا، جب تک اس کے اندر طلاطم پیدا کرنے کے لئے، کوئی غیر معمولی جرأت نہ کی جائے، سورج میرے آنچل پر انار کے پھول نچھاور کر رہا تھا۔ اس کے سر پر کرنیں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں اس کے بال ایسے نظر آ رہے تھے، گویا سیاہ ناگ کنڈلی مارے بیٹھا ہو،

جب وہ میری طرف دیکھتا تھا، تو میں چناب کی وسعتوں پر نگاہیں دوڑاتے دوڑاتے سر جھکا لیتی تھی۔ لہریں ایک لمحے کے لئے مسکراہٹ کے ساتھ اٹھتیں

اور پانی میں ایک بل سا آجاتا، اور یوں معلوم دیتا، سورج پانی کے اندر ہی اندر دھنستا جا رہا ہے، وہ اپنی سرخی اور شوخی میں مگن ہے وُہ نہ چناب کو اور نہ ہمیں دیکھتا ہے۔

اس شام چناب کوئی اور چناب تھا۔ اس کے پس منظر میں صدیوں کے واقعات اور برسوں کی الم ناک وارداتیں موجود تھیں، ایک ہلچل تھی پُر وقار ایک تلاطم تھا غیر معمولی ـــــ اس کا بہاؤ زندگی کا بہاؤ تھا، واقعات اس کی سرد مہری کو بیان نہیں کرتے، اسے خون آشام نہیں کہتے، وہ مبرّا ہے ہر الزام سے، اور ہمہ تن درد آشنا ہے، ہر خونی واقعہ سے، اگر کوئی اس کا تار چھیڑے تو اس سے ہمیشہ ایک دل فگار نغمہ اور پُر سوز آہ نکلتی ہے، اس وقت میں اور وُہ کتنے بھی کھچے کھچے بیٹھے ہوں، قریب ہو جاتے ہیں اور اس طرح نظر آتے ہیں، جیسے چناب کے بہاؤ پر ایک قالب ایک رُوح بہی جا رہی ہو!

محبت کا انجام اتنا تلخ نہیں ہوتا۔ جتنا دنیا سمجھ رہی ہے ـــــ

اس کا معمول ہو گیا تھا۔ کہ وہ ہر شام چناب کے کنارے میرا انتظار کرتا رہے ہم کتنے بھی محوِ آرزو ہوں اور کتنے بھی اُلجھے ہوتے ہوں، اس نے کبھی نہیں کہا چناب خونی ندی ہے، اور چناب کی خونچکاں داستان کو ہمیں بھی دہرانا چاہیئے، اس کا کہنا ہے ـــــ چناب خود گاتا ہے ہر روز گاتا ہے، اس کا ایک ہی گیت ہے، الم ناک آہوں سے معمور اور دردناک واقعات سے بھرپور

——اس نے بڑے بڑے پتھر دلوں کو رلا دیا ہے، وہ کبھی جذبات سے متاثر نہیں ہوا اُبُوہ باری باری اپنے اندر سب کچھ سمیٹ لے گا۔ گویا دھرتی پر اسی کا راج ہے۔

اس شام میں نے اپنی کلائی پانی میں ڈال رکھی تھی، میری چوڑیاں آپس میں بج رہی تھیں، جیسے سردی سے دانت بج رہے ہوں۔ ان کا ایک جال سا بن گیا تھا۔ اور پانی کلائی سے کٹ کر اس طرح گذر رہا تھا، گویا فصد کٹ کر خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہو، اور جب کوئی لہر میری کسی حرکت سے ہٹ کر اٹھکیلیاں کرنے لگتی تھی، تو دھیمے دھیمے نغمے بیدار ہوتے تھے، ننھے ہلکی ہلکی سرز میں اُٹھ رہے تھے۔ کھُلے کھُلے کھیتوں میں سرسوں کے زرد زرد پھولوں کا فرش بچھا ہُوا تھا۔ تمام فضا پر شام کے سکوت نے قبضہ جما لیا تھا۔ میں نے اپنی کلائی پانی میں سے نکال لی، وہ چونک اٹھا اور میری کلائی کو سینے سے لگا لیا۔ اور کہا، وہ نغمہ جو مجھے متاثر کر رہا تھا کیوں خاموش ہو گیا ہے۔ یہ کہہ کر میری کلائی کو سیمیں کلائی کو مضراب کہتے ہوئے پھر پانی میں ڈال دیا، اور کہا۔ یہ نغمہ یہ آواز، یہ درد بھری لے جو چناب تیری کلائی سے کہہ رہا ہے۔ مجھے بہت بھاتی ہے، میری روح کی گہرائیوں میں، اس نغمے کا وجود اور سوز چھُپا بیٹھا ہے۔

آج شام چناب ہے اور میں ہوں اور خاموشی ہی خاموشی ہے، اس تنہائی

میں اسکی یاد اور ملاقاتیں اور بھی اُجاگر ہو جاتی ہیں، سورج چھپ چکا تھا، چناب
وہ چناب نظر نہ آرہا تھا۔ خاموش کھیت اپنی وسعتوں میں پھیلے ہوئے کاشتکاروں
کے دلوں کی کیفیت کا پتہ دے رہے تھے۔ فضا چپ تھی۔ امیدیں دبی جا
رہی تھیں۔ نگاہیں پگڈنڈیوں پر دُور دُور تک جاتیں اور مایوس لوٹ آتیں ——
میں آج بار بار اپنی کلائیوں کو، کبھی ایک کو کبھی دوسری کو، اور پھر اسی کو جس نے
اسے بوسہ دیا تھا۔ اور مضراب کہا تھا، اور کہا تھا۔ یہ راگ، دنیا کی سمجھ سے بالاتر
ہے اس کی آواز کسی سمجھدار ہی کو سمجھ آسکتی ہے، پانی میں ڈالا، بار بار ڈالا، پر
میں کوئی نغمہ نہ سن سکی، میرا دل اس کے بغیر میں سوچتی تھی دل ہی نہیں ——
کتنے ہی رات کے سناٹے میں دریا تھم جاتے ہیں، دنیا پر سکوت چھا جاتا ہے، ہُو کا
عالم ہوتا ہے، چناب جاری تھا، وہ بہہ رہا تھا بغیر نغموں اور آہوں کے! ——
میرا دل مضطرب تھا، میں سہمی ہوئی تھی، میں اپنے آپ کو روکھا محسوس کر رہی تھی
چناب کے کنارے کوئی روئے آہیں بھرے، نالہ و فریاد کرے، مگر چناب متاثر
نہیں ہوتا، اس میں کوئی تلاطم، کوئی روشنی، کوئی شور نہیں اُٹھتا —— آج اُسے
نہ آنا تھا نہ آیا۔ آخر اُکتا کر میں نے اپنا گھڑا اٹھا لیا، جو میرے پہلو سے لگا بیٹھا
تھا اور چناب میں ڈال دیا، وہ یوں گھومنے لگا، گویا ایک گیند ہو اور ڈھلوان
کی طرف لڑھکتی جا رہی ہو۔

وہ نہ آیا اور نہ چناب نے وہ رنگین داستانیں سنائیں جن کے سنائے بغیر

اُسے کل نہیں پڑتی تھی، اُسے مجھ پر مطلق رحم نہ آیا، ایسا معلوم دے رہا تھا جیسے وہ مجھے دیکھ بھی نہیں رہا، وہ میری تنہائی کا احساس نہیں رکھتا، میرے جذبات کی پروا بھی نہیں کرتا —— اس نے میرا گھڑا خالی کا خالی رہنے دیا اور اُسے بے دردی سے اچھال کر کنارے کی طرف دھکیل دیا —— خالی بالکل خالی، جس طرح میں خود اپنے آپ کو احساسات سے خالی اور بے جان محسوس کر رہی تھی —— اندھیرے کی تہوں پر تہیں جم رہی تھیں، میرا دل اور بھی غم سے بھرتا جاتا تھا میرے چاروں طرف دہشت پھیلتی دکھائی دے رہی تھی، اکیلے میں میرا سانس بہت رُک رُک کر چل رہا تھا، دیر ہوتی جا رہی تھی، مجھے گھر جا کر سینکڑوں کام ابھی کرنے تھے، سارے گھر بھر کے بستر، مویشیوں کو چارہ، پانی —— میرا بوڑھا باپ میری راہ دیکھ رہا ہوگا، میرے بھائی دودھ پینے کے عادی ہیں، ہر ایک پوچھتا ہے "دودھ گرم لائی ہو، بھوری کا ہے نا" —— مجھے گھر جانا ہے، کتنی دیر ہوگئی ہے، دیر سے جاؤں تو فقیر کا کتا بھی بھونکنے لگتا ہے، میرے پاؤں کی چاپ پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں —— تمام گھر منہ اُٹھائے، آنکھیں کھولے میری راہ دیکھ رہا ہوگا۔

میرا گھڑا پانی سے خالی تھا، اس طرح کہ گویا کوئی جذبات سے خالی ہو، آج رات تمام کام کیونکر انجام دے سکوں گی، اندھیرے میں میری نگاہ کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر، ہموار زمین پر، جولانیاں کرتے کرتے بے نور ہوتی جا رہی تھی

پھر میں خود بخود ایسی معلوم دے رہی تھی، جیسے میں چناب کی گہرائیوں میں آہستہ آہستہ اُترتی جا رہی ہوں۔ پانی ہی پانی تھا۔ جہاں تک حدِ نگاہ جا رہی تھی، گویا میرے پاؤں کے نیچے کوئی نازک نازک ہاتھ رکھے، سطحِ آب پر لئے جا رہا تھا۔

اب کوئی راہ گذر آتا تھا نہ کوئی سُست رفتار کسان۔ ستارے گذشتہ راتوں کی طرح ٹمٹما رہے تھے، مگر اتنے مضطرب نہ تھے، کہ کوئی کہہ سکتا کہ ان کے اور چناب کے درمیان بھی کوئی راز ہے۔ وہ اور میں چناب کے کنارے بیٹھے ہوں تو مجھے تمام کائنات سے کبھی ڈر معلوم نہیں ہوتا۔ مجھے گھر بھول جاتا ہے، اور پھر گھر بھر کے بستر ے اور دُودھ پلانا بھی، جو میں ایک ایک کو باری باری پلاتی ہُوں اور کہتی جاتی ہوں "ہاں بھُودی ہی کا تو ہے"——اندھیرے میں اب شکلیں بننے لگی تھیں، خیالات خود بخود بگولا بن کر اُٹھ رہے تھے، مجھے یاد آ رہا تھا، میں محسوس کر رہی تھی، ہیر رانجھے، سوہنی مہینوال نے کیوں اس جگہ کا انتخاب کیا تھا ——یہ سب خیال اب میرے دل میں چٹکیاں لے رہے تھے، چناب چل رہا تھا، وہ بہہ رہا تھا۔ وہ راتوں کو کبھی نہیں تھمتا میں گھر تک کیسے پہنچ سکوں گی۔ یہ میں نے دل سے سوال کیا تھا۔ کتنی سہم گئی تھی میں، کتنا کٹھن نظر آ رہا تھا مجھے راستہ، کتنا اندھیرا تھا، خوف دہشت، ڈائن، بھوت پریت، سانپ اور بچھوؤں سے بھرپور راستہ —— مجھے گھر تک کون پہنچائے گا؟ مجھے گھر کا ایک ایک کام انجام دینا ہے، میں نے جلدی سے اپنا گھڑا پانی میں ڈال

دیا، اب پانی کا جھٹکا اس زور سے لگا کہ میں چونک اٹھی اور مجھے اکیلے پن کا احساس بھول گیا، میں نے اُسے اپنی طرف کھینچنا چاہا مگر نہ کھینچ سکی، گھڑا میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا، اس طرح گویا کسی نے جھپٹ کر زبردستی مجھ سے چھین لیا ہو، رات کا سناٹا اور میں تنہا تھی، چناب کا کنارا اور سکوت تھا۔ ایک لہر تڑپی، ایک جھنجھلاہٹ سی بلند ہوئی، چناب کے سینے کو چیرتی ہوئی گزر گئی، اور وہ آواز سرد آہ کی طرح فضا میں گونجنے لگی، پھر ایک اور لہر جھپٹی اس نے چناب کی سطح پر تلاطم بپا کر دیا، جیسے کوئی اہم واقع ہونے والا ہو ——— میں کتنی دیر چناب کے کنارے کھوئی کھوئی بیٹھی رہی، اور کتنی بار یہ خیال کرتی رہی۔ چناب کوئی پرانی داستان دہرائے گا وہ کوئی المناک واقع بیان کریگا اور وہ آ جائیگا جس کا مجھے انتظار ہے۔ مجھے آواز آئی جیسے کوئی مجھے پکار رہا ہو، اور مجھے یہاں سے چلے جانے کو کہہ رہا ہو تیرا دل حقیقی محبت کی لذت سے ناآشنا ہے، چناب مقدس ہے اس کی عظمت کو نہ کھو، ——— میں لرز اٹھی میرا رواں رواں کانپ رہا تھا، مجھے ایسا نظر آ رہا تھا کہ چناب میں کود پڑنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہا، مجھے اپنے آپ کو اس کی لہروں کے سپرد کر دینا چاہیئے کیونکہ پرانی داستان کو دہرانے کے بغیر گزارہ ہی نہیں، ——— کاش میں کہہ سکتی، میرا رونا بھی محبت کا رونا ہے۔ میں بھی دل رکھتی ہوں جس میں پاک الفت اور بے لوث محبت نے اپنا گھر کیا ہوا ہے میری بھی سرشار اور مخمور آنکھیں ہیں، جیسی الفت میں ہوتی ہیں ——— چناب پر

بسنے والی لڑکیاں کیا نہیں جانتیں ؟ ان تمناؤں کا اظہار جو زبان پر نہیں آتیں، ان لافانی آرزوؤں کی حسرت جو کبھی پوری نہیں ہوتیں ——— وہ سب کچھ سمجھتی اور جانتی ہیں۔ ان میں بھی زندگی ہے ۔ ان ہی سے ہیر اور سوہنی جیسی حقیقی عشق و الفت پر بھینٹ چڑھ جانے والیاں ہو گذری ہیں!

چناب میں ایک خوفناک شور پیدا ہوا، ایک دردناک آواز اٹھی جیسے وہ بول اٹھا ہو ——— اس کی آواز، میرا حوصلہ پست کر رہی تھی، میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ مجھے طعنے دے رہی تھی، تیرا باپ تیری راہ دیکھ رہا ہے۔ تیرے بھائی بھوسی کے گرم دودھ کا انتظار کر رہے ہیں ——— تیرے مویشی چارہ اور پانی کے بغیر بھوکے مر جائیں گے، کون ہے جو تیری ضرورت نہیں رکھتا، الھڑ لڑکی، نادان اکیلی کھوئی ہوئی بھاگ جا، رات اندھیری ہو گئی ہے، راستہ خوف، دہشت، سانپ اور بچھوؤں سے اٹا ہوا ہے، تیری امنگوں اور آرزوؤں سے بھری جوانی تو دن بھر کھیتوں میں اچھلتی کودتی پھرتی ہے۔ تیری رعنائی کون نہیں محسوس کرتا، کتنے لڑکے ہیں جو تیرے پیچھے بھاگتے بھاگتے ہانپنے نہیں لگتے، ہنستے ہنستے تیرے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں ——— الھڑ لڑکی نادان بھولی بھالی خوب صورت جا بھاگ جا ——— دھان کے کھیت کھلتے ہیں، تو تو بھی کھلکھلا اٹھتی ہے ——— تیرے گاؤں کے نڈر چھوکرے تیرا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں، تو تو بھی رک کر کھڑی ہو جاتی ہے! ———

میرا جسم نامعلوم آتش سے بھڑک اٹھا تھا، میرا رواں رواں زبان بن گیا تھا

——— میں بولی، میری زندگی کے رومان میں اس کا زبردست حصہ ہے میرے رخسار اس کے لمس کے لئے بے تاب ہیں، میرا سینہ اس کے سینے سے لگ جانے کے لئے ارتعاش لئے ہوتے ہے۔

ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اسکی آنکھیں نور کی طرح چمک رہی تھیں، اس کے سانس میں اعتماد تھا اور چہرے پر عزم، اس نے کہا "ہم اپنا قول پورا کریںگے ——— چاہے ماں باپ بہن بھائی، یہ زمین، یہ کھیت، لوگ سب کچھ ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے ——— چناب کی سطح پر ابھی بہت سی جگہ خالی پڑی ہے۔ ہم بھی اس میں سما جائیں گے ——— چناب نے اس وقت ایک کروٹ لی، چناب دریا نہیں آنسوؤں کا سیلاب ہے، اس کے مدوجزر میں سینکڑوں حسین داستانیں پوشیدہ ہیں، اس کی لہروں کے تلاطم میں کتنی المناک وارداتیں ہو گزری ہیں، یہ ایک رومان بھری ندی ہے، اس کی سطح پر ابھی بہت سی جگہ خالی پڑی ہے۔ یہ کبھی نہیں تھمتا، یہ ازل سے رواں ہے اور اسی طرح ابد تک رواں رہیگا نغموں اور آہوں کے ساتھ! ———

بُت کدہ

آشوک کے پرانے مندر، ابھی تک اپنی قدیم تہذیب اور عظمت کا مظہر تھے۔ مگر ان کی روحانی برکتیں بالکل بانجھ ہو چکی تھیں۔ بستی تھی اور چند گھر جو جاتریوں کے رحم پر آباد تھے۔ یہ لوگ جاتریوں کی راہ تکتے تکتے ذلت اور للچا کی زندہ تصویر بن گئے تھے۔ کوئی نہ کہہ سکتا تھا۔ یہ اسی تہذیب اور عظمت کے صحیح وارث ہیں، جنہوں نے یہ مقدس معبد اور مندر آباد کئے تھے۔ یہ قدیم بستی، یہ پوتر استھان، جو آشوک کی شخصیت کا کاران تھا۔ بدھ مت کے حامیوں نے دنیا کو تیاگ کر اور تمام لہو لہب کو ٹھکرا کر بنایا تھا۔ اب جس طرف دیکھو، ندامت ہی ندامت برستی تھی، سوائے اس یادگار کے، جس کو دیکھ کر بے اختیار قدم قدم پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ کچھ بھی تو موجود نہ تھا۔ بدھ نے اپنے مت کو پھیلانے اور اس کا پرچار

کرنے کے لئے کیا کچھ نہ کیا تھا!

اشوک کے پرانے مندروں کے اردگرد جدھر دیکھو، دل بے اختیار قدم قدم پر وجد کرتا جاتا تھا، یہاں ابھی عہد قدیم کی عظمت اور عظیم الشان ہستیوں کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی تھی، یہاں رہنے والے سنگ تراشوں میں بت سازی کا ذوق ابھی تک باقی تھا۔ لیکن وہ اپنے تیز آہنی قلموں سے ویسے بت نہیں تراش سکتے تھے، جیسے ان کے آبا و اجداد نے اونچے اونچے پہاڑوں کو الٹ پلٹ کر تراشے تھے، اس دور کے بت ساز یا تو اپنے سینے میں کوئی حقیقی جذبہ نہیں رکھتے تھے، یا انہیں معبدوں سے محض زر کے لئے ایک لگاؤ سا رہ گیا تھا۔ وہ صنعت گر جو ان سے بہت پہلے گزر چکے تھے، اب میسر نہ آسکتے تھے! وہ بے جان پتھروں میں روح ڈالنے کی قوت رکھتے تھے، انہوں نے بدھ کی مورتیاں تراشی تھی، اس کی خمار آلود آنکھوں میں رس بھرا تھا۔ اس کے کنول نما ہاتھوں سے، بڑے بڑے گہرے مطالب پیدا کئے تھے۔ مگر ان کے وارث، ان کی یادگار، یہ بت تراش قدرتی حسن کو غارت کرنے میں ہمہ تن مصروف نظر آتے تھے۔ یہ اپنے بتوں کی حیثیت مٹی کے کھلونوں سے بھی کم تر سمجھتے تھے، جب کوئی ان کی خدمت کرتا تھا۔ تو فخریہ بیان کرتے تھے۔ ہم اپنے آبا و اجداد کی یادگار ہیں۔ ہم ان کی وراثت کے مالک ہیں، ہم بت ساز اوتار اور دیوتاؤں کے بت بناتے ہیں، ہمارے آہنی قلم بھی، اس پوتر جل میں بجھے ہوئے ہیں، جسے بدھ مت نے برکت کے لئے پاؤں

اس بستی کے رہنے والوں سے جو اتنے بڑے بڑے دعوے کرتے تھے اور کہتے جاتے تھے ہم ان کی اولاد ہیں جنہوں نے یہ پوتر استھان، یہ مندر، یہ معبد بنائے ہیں۔ ان کے منہ سے رال ٹپکتی تھی جب یہ کہتے تھے کہ دان کا حق ہمیں پہنچتا ہے۔ ان میں نہ کوئی حقیقی جذبہ معلوم ہوتا تھا اور نہ وہ مذہبی پرستاری نظر آتے تھے۔ زر کے بندے زر اکٹھا کرنے کے لئے یہی کہتے تھے انہیں ناگ دیوتا کا بھی پالن کرنا ہوتا ہے۔

جب یاترا ہوتی تھی اور جاتریوں کے آنے کا سمے قریب آتا تھا، تو یہ بُت تراش بُت تراشنے اور بُت بنانے میں بڑی سرگرمی دکھاتے تھے اور سمجھتے تھے تہوار آرہا ہے کچھ نہ کچھ ہونا ضروری ہے۔ بستی کی لڑکیاں بھی ان دنوں بت بنانے اور تراشنے میں ہمہ تن مصروف رہتی تھیں۔ وہ نہایت دیانتداری سے ماں باپ کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ ان کے بنائے بتوں میں زندہ جذبات کا پرتو نظر آتا تھا۔ وہ جانتی تھیں ان کے بت مردوں سے کہیں زیادہ اچھے ہیں۔ انہیں بھی اپنے بتوں پر اپنے فن پر مان تھا۔ جاترا ہوتی تھی تو زردار جاتری بت تراشوں کی بدمذاقی کے باوجود وہاں کثرت سے آتے تھے۔ وہ منہ مانگی قیمتیں دے کر بدنما اور بھدے بتوں کو بڑے احترام سے خرید لے جاتے تھے۔

بستی کی شرمیلی، نیم عریاں لڑکیاں، جاتریوں کی دلجوئی اور خدمت گزاری میں کافی سے زیادہ دلچسپی لیتی تھیں، جاتریوں کی آمد ایک بڑے تہوار کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اور یہ جگہ ایک بڑا آباد شہر معلوم دینے لگتی تھی۔ اس تہوار پر

ان داسیوں کے پاؤں، جو سارسوں کی طرح نازک اور کومل تھے۔ جگہ بہ جگہ اُٹھتے اور بیٹھتے دکھائی دیتے تھے۔ سُرخ اوڑھنے ان کا پسندیدہ لباس تھا۔ وُہ اِس لباس میں پوتر نظر آتی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اوتار اور دیوتا اسی لباس میں دھرتی پر آتے تھے۔ اور دنیا نے ان کے سامنے سیس نوایا تھا۔ ان نگارنگ دلچسپیوں کے اندر جاتریوں کی سیوا میں سب سے زیادہ حصّہ لینے والی ایک حسین لڑکی انزودی تھی —— انزودی ایک غریب لڑکی تھی، اس کے ماں باپ نے اس کے لئے سوائے بُت تراشی کے کچھ نہ چھوڑا تھا —— اسے اپنے کمال پر ناز تھا۔ اور بجا ناز تھا۔

بستی کی لڑکیاں مندروں اور معبدوں کی داسیاں کہلاتی تھیں، اور وُہ جو شادی کے لئے انتخاب کی جاتی تھیں، وہ اپنے فرائض کسی دوسری لڑکی کو، جو انہیں عزیز ہوتی تھی، سونپ دیتی تھیں، وہ ایک مالا بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیتی تھیں، اور خود سبکدوش ہو جاتی تھیں۔ یہ مالا ڈالنے کی رسم اس بستی میں بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی تھی، یہی ایک دلچسپ رسم تھی، جس کے سبب وہاں آج تک زندگی کا پرتو، زندگی کا حسن دکھائی دے جاتا تھا۔ وُہ لڑکی جس کو شادی کرنے کا حق دے دیا جاتا تھا، یا یوں کہو جس لڑکی کو شادی کرنا مقصود ہوتا تھا۔ وہ لڑکی، ایک لڑکی چن لیتی تھی، جو اس کی ہمجولی اور رازدار کہلاتی تھی۔ وہ اسے سب کچھ سونپ دینے کے لئے شادی سے ایک رات پہلے

اس کے ساتھ اکٹھی سوتی تھی۔ اور اسے تمام رازوں اور جذبات سے آگاہ کرتی کہ وہ شادی کی زنجیروں میں کیوں جکڑی جا رہی ہے۔ اس رات کو حاصل کرنے کے لئے لڑکیاں اپنے جذبات کے ساتھ کتنی جنگ کرتی تھیں، یہ لڑکیاں ہی جانتی تھیں!

اتردی نے جب سے راجکمار کو دیکھا تھا۔ وہ سوچتی تھی، کیا وہ رات اس کے لیکھ میں بھی لکھی ہے یا نہیں —— وہ سب کی ہمت سے بلند اپنے راجکمار کو دیکھتی تھی اور کہتی تھی، ہر لڑکی کے لئے ایک راج کمار کا ہونا ضروری ہے، اتردی نے جب سے راجکمار کو دیکھا تھا۔ وہ اپنے تراشے ہوئے بتوں کو اصلی روپ میں دیکھنے کے لئے بے تاب رہتی تھی، وہ چاہتی تھی، اس کا ہر تراشا ہؤا بُت راجکمار نظر آئے۔ اس دھن نے اس کے فن کو دیکھتے دیکھتے کہیں کا کہیں پہنچا دیا تھا۔ وُہ جاتریوں میں اتنی مقبول ہوتی جا رہی تھی کہ ساری بستی کی بستی اس سے حسد اور رشک کرنے لگی تھی۔ اتردی کے بنائے ہوئے بُت جاتریوں میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتے تھے۔ ان کی بڑی بڑی قیمتیں ملتی تھیں مگر خرید و فروخت کی کثرت سے اس کے کمال میں کوئی کمی نظر نہ آتی تھی۔ یہ اتردی کے کمال کی پختگی اور دائمی ہونے کا ثبوت تھا۔

اتردی دوسری لڑکیوں کی طرح زندگی کے حقائق سے بے خبر نہ تھی اس کے سینے میں بھی دل تھا جس میں بُت، دیوتا اور اوتار رہتے تھے۔ راجکمار کو

دیکھ لینے کے بعد وہ سوچنا بھی سیکھ گئی تھی۔ وہ سوچتی تھی۔ یہ زندگی جو اس قدر روکھی نظر آ رہی ہے، اس میں رنگ بھی بھرے جا سکتے ہیں —— اس نے راجکمار کو دیکھنے کے بعد ایک دو نہیں سینکڑوں بُت اس دھن میں بنائے تھے جس دھن میں راجکمار کا تصور کرتی رہتی تھی —— وُہ یہ جاننے پر مجبور تھی کہ اس میں عورت بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ جانتی تھی۔ جب بستی سے جُدا ہونے کی رسم کے مطابق اُسے سندرتا سے سلا دیا جائیگا۔ تو وہ رات بھر سندرتا کو اپنے تمام راز بتاتی رہے گی۔ وہ سُندرتا کو بھی نصیحت کرے گی کہ وُہ بھی کسی راجکمار کا انتخاب کرے۔ کیونکہ یہ وقت ہر سندرتا پر آئیگا اور جو وقت آنے والا ہے۔ اس کے لئے تیار رہنا ہر سندری کے لئے فرض ہے ——
سندرتا کا خیال آتے ہی راجکمار اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا۔ وُہ خیال کرتی وہ ہے اور راجکمار ہے —— اور وُہ نیلے گھوڑے پر سوار گھاٹیوں کو چیرتے ہوئے، راجکمار کی راجدھانی کی طرف جا رہے ہیں۔ اس کی آشا تھی۔ جب اس کی رخصت کی رات آئیگی۔ تو وہ اس پوتر جل پر جائے گی جس کو بُدھ کے پاؤں نے چھوا تھا۔ اس پوتر جل کی عظمت میں رتی بھر فرق نہیں آیا۔ وہ اس جل میں اشنان کریگی۔ وہ بالوں میں خوشبو لگائے گی۔ پھولوں کے زیور پہنے گی۔ اپنی مانگ کو سیندور سے رنگے گی، جی بھر کر مندر کے صحن میں ناچے گی اور ناچتے ناچتے کھو جائیگی۔ راجکمار آئیگا،

اور اسے اپنے نیلے گھوڑے پر بٹھا کر اپنی سنہری کلسوں والی بستی کی جانب۔ لے جائیگا جب پہلی دفعہ راجکمار نے اس کا بنایا ہوا بُت خریدا تھا تو راجکمار نے اس سے پوچھا تھا۔ کیا تم مٹی کے یہ مادھو ہی بنانا جانتی ہو، یا راجکمار بھی ——— وُہ چپ کی چپ رہ گئی تھی۔ اس کے تمام بُت، وہ مٹی کے مادھو راجکمار نے خرید لئے تھے، اس قیمت پر خرید لئے تھے، جس پر کوئی راجکمار ہی خرید سکتا تھا۔ اس روز سے اُتر دی کو ایک مان ہو گیا تھا۔ اس مان نے بستی کے مان کی ایک نئی راہ پیدا کر دی تھی، اسے اپنے فن پر ناز تھا۔ وہ اسی ناز اور مان پر جیتی تھی، اور اسی مان پر اس نے سندرتا سے، اپنے تمام راز کہہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جب سے سنہری کلسوں والی راجدھانی کے راجکمار نے اس بستی میں آنا شروع کیا تھا بستی کی رونق دوبالا ہو گئی تھی۔ راجکمار کی نگاہ اتر دی پر ضرور تھی۔ اس لئے نہیں کہ وُہ اسے بیاہ لے جائیگا۔ یا وہ راج رانی بنے گی راجکمار جانتا تھا۔ وہ ایک اچھی صناع اور سنگ تراش ہے۔ اس کے تراشے اور بنائے ہُوئے بتوں کے سبب بستی کی عزت اور عظمت ہے۔ بڑے بڑے کہنہ مشق بت ساز ہاتھ پر ہاتھ رکھے آنے جانے والوں کا منہ تکتے رہتے تھے۔ اترو دی کی شہرت اور اپنی آمدنی کم ہو جانے سے انہیں مجبوراً اپنے فن کی طرف دوبارہ توجہ دینی پڑی تھی ——— مگر ان کی ہر کوشش بیکار ثابت ہوئی۔ ان کے پاس ان کی سمجھ کے مطابق اس ذلت سے بچنے کے لئے ایک ہی وسیلہ رہ گیا تھا انہوں نے

سوچا، اشوک کے پرانے مندر سے قدیم بت نکال نکال کر بیچ ڈالیں، جن میں ابھی تک بدھ کی بزرگی اور الوہیت جلوہ گر ہے۔ وہ قدیم مندر اور بتوں کو اپنی موروثی جائداد سمجھتے تھے۔ یہی ایک راستہ تھا جس پر چل کر وہ اُترودی کے سامنے اپنی کمزوریوں کو چھپا سکتے تھے، وہ بدھ کی مورتیاں جن کو بنانے والوں نے اپنے خون سے بنایا تھا۔ دل اور جذبات سے تراشا تھا۔ اور راہبوں نے دنیا کو تیاگ کر ان کے اندر روح پھونکی تھی، بے دردی سے نکال نکال کر فروخت کرنے لگے۔ اور ان کی جگہ اپنے بنائے ہوئے بدنما، جذبات سے خالی اور روحانیت سے عاری بُت رکھنے لگے —— ان کی یہ نازیبا حرکت، پست ہمتی اور کم مائیگی کی دلیل تھی —— یہ قدیم سرمایہ، یہ بے بہا خزانہ، جو ان کے آباؤ اجداد نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے جمع کیا تھا۔ نہایت بے پروائی اور بے دردی سے لٹ رہا تھا۔ اشوک کا ذوق مٹ رہا تھا۔ آبادی پیٹھ پیچھے منہ موڑے سسکیاں لے رہی تھی، ان کی اس نازیبا حرکت سے ان کی آمدنی میں اضافہ تو ضرور ہو گیا تھا۔ جاتری بھی تعداد میں زیادہ آنے لگے تھے۔ دان بھی زیادہ چڑھنا شروع ہوا تھا۔ خرید و فروخت بھی زیادہ ہونے لگی تھی۔ انہیں منہ مانگی قیمتیں ملنے لگی تھیں۔ مگر قدیم بت کدہ کی سرزمین رفتہ رفتہ اگلے وقتوں کی صنعتوں اور برکتوں سے محروم ہوتی جا رہی تھیں، وہ سرمایۂ حیات، وہ زندگی کے نشان، وہ تیاگ، وہ اَن مٹ پریم ختم ہوتا جا رہا تھا۔ جسے قدیم صناعوں اور سنگتراشوں

اپنا خون پسینہ بہا کر قائم کی تھی بستی کا سہاگ اُجڑ چکا تھا۔ اب وہاں کوئی جذبہ تھا۔ نہ کوئی اثر، کوئی شکوہ تھا نہ کوئی تقدس، غرض کچھ بھی باقی نہ رہا تھا جس سے یہ بستی بستی تھی، اور یہ پوتر استھان، پوتر استھان کہلاتا تھا۔ اس سکوت افزا منظر میں آشوک کے قدیم مندر، ویران کھڑے فریاد کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ جب یہ پرانا سرمایہ ختم ہو گیا۔ تو بت فروشی کا بازار بھی سنسان اور ماند پڑ گیا۔ اب نہ کوئی جاتری اور نہ کوئی خریدار وہاں آتا تھا۔ اشوک کے بے حمیت وارث اپنی ان حرکتوں پر ذرا نادم نہ تھے اور نہ انہیں اس کا کچھ احساس تھا کہ انہوں نے اپنے بزرگوں کی میراث آہستہ آہستہ کر کے بیچ ڈالی ہے

آہستہ آہستہ اتردی نے اپنے جذبات کا خون کر ڈالا۔ اس نے اپنی تمام شہرت کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس کا مان ٹوٹ گیا۔ وہ پتھروں کو تراشنا اور اوتار اور دیوتا بنانا بھول چکی تھی —— وہ اپنی حسرتوں کے نشہ سے سرشار پتھروں سے کھیلنا بھی بھول گئی تھی —— بے جان پتھر جو اتردی کے لمس سے لرزنے لگتے تھے۔ ان سے نئی نئی شکلیں پیدا ہوتی تھیں، اس کا پیچھا کرتے تھے۔ اسے اشوک اور بدھ کا واسطہ دیتے تھے۔ وہ فریاد کرتے تھے۔ وہ آہیں بھرتے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اتردی کا دل نہیں پسیجتا تھا۔ اُتردی مایوس تھی۔ اس کی مایوسی کے اسباب موجود تھے۔ زر کے بندے، بے حس و حرکت انسان، اپنی پونجی کھو کر خوش تھے۔ انہیں اپنی بددیانتی پر ذرا بھی غم نہ تھا۔ انہیں اپنی ذلت اور کم مائیگی کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ اتردی بے دل ہو چکی

تھی، اس کا مان ٹوٹ چکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ وہ ایک رات سُندرتا کے ساتھ سوئے گی۔ اور اسے اپنے تمام راز کہہ دیگی۔ جو اس نے راجکمار کے متعلق سوچ رکھے تھے۔ وہ سٹھیائے ہوئے سنگ تراشوں کے عمل سے افسردہ ہو چکی تھی، کوئی نہ جانتا تھا۔ اس کے دل میں کیا ہے اس کی کوششوں میں کیا کچھ مضمر ہے۔ وہ پہلا پیار اور پریم، جو تمام بستی پر چھایا ہوا تھا۔ کہاں کھو گیا ہے۔ وہ جاتری جو کچھ دن پہلے مندروں میں دولت نچھاور کرنے آتے تھے۔ اب کیوں نظر نہیں آتے، ہاں کبھی کبھی سنہرے کلسوں والی راجدھانی کا راجکمار، اپنے نیلے گھوڑے پر سوار گردونواح میں اس کی تسلی اور حسرت کی تصویر بن کر ضرور نظر آجاتا تھا۔ مگر اتردی کی مضطرب تمنائیں، اور زار حالی کے اثرات اسے بھی اچھا نہ سمجھتے تھے، ہر چند اشوک کی گذشتہ عظمت کی یاد میں دان بانٹنے والا وہی تنہا رہ گیا تھا۔

اتردی جس قدر ظاہرا اچھی تھی، اسی قدر گہری بھی تھی۔ اسے اشوک کی اس پرانی مقدس یادگار کی ویران اور اگلی برکتوں کی بربادی کا بے حد غم تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی، کہ اب حقیقی مسرت اوتاروں کی دیا، روح کی شانتی سبھی کچھ گم ہو گیا ہے —— ساری بستی پہلے سے زیادہ بدحالی اور پستی میں دب گئی تھی، وہ ان زرپرستوں کی نازیبا حرکتوں سے بالکل نڈھال ہو چکی تھی۔ وہ ان حوادث میں گھری ہوئی، مایوسی کی تصویر، طوفان میں پھنسی ہوئی کشتی کی طرح

ساحل سے دور ڈگمگا رہی تھی، اس سے پہلے کہ وہ گرے یا سنبھلے، اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنا سینہ چیر کر اپنے جگر کا خون اپنے ایک تراشے ہوئے بُت پر چھڑک دیا ـــــ اس کے بعد بستی نے دُور دُور تک اُرودی کو نہ دیکھا۔ لیکن آشوک کی ویران نما بستی میں، صرف راجکمار کی ایک مورتی نظر آتی تھی اور وہ بھی خون آلود ـــــ!

کاجل

حسنی سپیرا ٹپار پر سر رکھے کنڈلی مارے سستا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے گرد و غبار میں مختلف شکلیں اُبھرتی اور بنتی تھیں، بنتیں اور مٹ جاتی تھیں پھر اس سے اتنی دور ہٹ جاتی تھیں کہ وہ دیکھتے دیکھتے اونگھ جاتا تھا ——
افق کے پار کیا ہے، حسنی سپیرا کچھ نہیں جانتا تھا۔ جو کچھ وہ جانتا تھا۔ صرف اتنا ہی تھا کہ ان کے جھونپڑے ان کی بستی اور کھلے میدان جن سے ان کی زندگی وابستہ ہے افق کے پار واقع ہے، افق کے پار کتنی پیاری، کتنی اچھی جگہ ہے جسے خانہ بدوش سپیروں نے اپنے لئے چن رکھا ہے، وہاں دُور دُور تک پھیلا ہُوا۔ گرم ریتیلا میدان ہے، وہاں طاؤس بولتے ہیں اور ناگ رقص کرتے ہیں۔
گرمی کا عالم تھا۔ ڈھلتی دوپہر میں وادی سے دُور میدان کی حد بندی پر

ایک گھنا سایہ دار برگد کا درخت اپنے پھیلاؤ کے نشے میں زمین سے اونچا اور بلند کھڑا تھا —— یہ برگد کا درخت حسنی سپیرے کو اس طرح سائے میں لئے ہوئے تھا۔ جیسے کوئی ممتا کی ماری ماں اپنے بچے پر جھکی ہوئی ہو۔ برگد بازو چھوڑے، شانے جھکائے دنیا بھر کے انجام پر متفکر نظر آتا تھا۔ اور ایسا معلوم دیتا تھا۔ دنیا کے انجام پر غور کرتے کرتے برگد کی نگاہیں، دھرتی کی آخری سطح پر جا لگی ہیں۔ اسی برگد کی عمر کا اندازہ کوئی بھی تو نہیں کر سکتا۔ نوجوان حسنی سپیرا خود اپنی عمر کا اندازہ نہیں رکھتا تھا —— برگد کے سائے میں پڑا استاتا ہوا وہ اس بات کی کب ضرورت سمجھتا تھا۔ کہ وہ دنیا بھر کے انجام پر غور کرے، اور برگد کی عمر کا اندازہ لگائے، دنیا کا انجام فانی ہے، وہ مٹنے والی ہے —— پھر فانی چیزوں پر غور کرنا۔ مزدور کا کام تھوڑا ہی ہے۔ مزدور دنیا کی ہاؤ ہو سے تھک کر سو جانے کا عادی ہے حسنی سپیرے کی بھی اونگھتے اونگھتے آنکھیں مند گئی تھیں وہ سو گیا تھا۔ ایک گہری اور بے فکر نیند۔

وہ گلی گلی، کوچے کوچے مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ اپنا ناگ اور اپنی پٹار اٹھائے در در پھر کر روزی اکٹھی کرنا۔ اس کا مقصد اور کام تھا۔ اس نے بیسیوں دفعہ اپنا زہریلا ناگ جس کی تمام برائیوں اور خوبیوں سے وہ واقف تھا۔ نکال نکال کر بچوں، بوڑھوں نوجوان، لڑکوں، لڑکیوں، نئی نویلی دلہنوں کو دکھایا تھا۔ اور کہا تھا۔ اس دشمن پر، موذی پر میرا پورا پورا قابو ہے، اس کے کاٹے کا منتر

ہے نہ جادو۔ اس کا ڈسا ہوا پانی نہیں مانگتا"۔۔۔ اس وقت اس کا سیاہ اور چمکیلا ناگ بڑا خوب صورت معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنے ناگ سے مطمئن تھا جب امید سے زیادہ کما لیا تھا، تو اسے پٹار میں ڈالتے وقت کہتا تھا"۔ تیری عمر بہت بڑی ہے، ابھی ہیں نے تجھ سے کام ہی کیا لیا ہے"؟

ناگ کو پٹار کی چار دیواری تنگ تنگ نظر آتی، تو وہ کنڈلی ابھار دیتا۔ پھن پھیلا کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔۔۔ جیسے بانبی سے سر ابھار رہا ہو، پر حسنی سپیرا اسے اس طرح دبوچ لیتا گویا کوئی بچہ کسی گیند کو دبوچ لیتا ہے۔ حسنی سپیرے کی گرفت میں طاقت تھی، ناگ پھر پٹار میں سکڑ جاتا۔ کنڈلی مارے سانس سادھ لیتا گویا اس نے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا ہو۔

یہ افعی، یہ سیاہ ناگ حسنی سپیرے کے باپ نے بار کے تپتے ہوئے میدان سے پکڑا تھا۔ بہار کا موسم تھا، چاندنی راتیں تھیں، ان راتوں ہی میں ناگوں کا زہر عود کر آتا ہے اور ہر ناگن اور ناگ اپنے جوڑے کی تلاش میں بانبی سے باہر نکل آتا ہے۔ ناگ ناگیاں مل کر ناچ رچاتے ہیں۔ ان کا زہر خمار ہو کر نکلتا ہے، اس وقت اس کلر والے تپتے ہوئے میدان میں کسی کو قدم رکھنے کی جرأت نہیں ہوتی، ضدی اور دلیر سپیرے ہمیشہ ان خونبار راتوں کی ٹوہ میں رہتے ہیں جب سانپ اپنی پوری خونباری سے ان میں کھیلتے اور ایک دوسرے پر زہر اچھالتے ہیں، سپیرے سی ناگ، افعی ناگ، شش ناگ۔ یہاں تک کہ ناگ دیوتا کو بھی

نگاہ میں لے لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں یہی تو مجھے پکڑنا ہے جس کے کاٹے کا منتر ہے نہ تریاق —— اس کے لئے پچھلے سال ہی ایک پٹار بنایا تھا —— حسنی سپیرے کے باپ نے ہمیشہ جان ہتھیلی پر رکھ کر ایسے سانپوں کو نیچا دکھایا تھا اور ان کو قابو میں لاکر پالتو جانوروں سے بھی بدتر کر دیا تھا۔

وہ غیر محفوظ مقام جہاں یہ خانہ بدوش رہتے تھے دُور دُور تک پھیلا ہوا کسی لق و دق صحرا سے کم نہ تھا۔ اس میں سپیروں کے جھونپڑے باچھیں کھولے اسی طرح کھڑے تھے، جس طرح ہڈیوں کے پنجر کھڑے کر دیئے گئے ہوں سپیروں کے مرنے اور جینے کی یہی جگہ تھی۔ اس فضا میں پرندوں کا بھی دم گھٹتا تھا —— چاندنی راتوں میں سپیروں کے بچے بچیاں جب ان ناگوں کو دیکھ پاتے تو نڈر اور ماہر سپیروں کی طرح ان کے پیچھے بھاگ اُٹھتے۔ ان کے شور سے سپیرے جھونپڑوں سے نکل آتے پھر ناگ ناگنیاں بجائے بانبیوں میں جانے کے اپنے آپ کو سپیروں کی پٹاروں میں بند پاتے —— ان چاندنی راتوں اور سانپوں کی دنیا میں حسنی سپیرے نے بھی پرورش پائی تھی۔ چودھویں کا چاند ہو۔ یا تاروں بھری رات، جلتی دھوپ ہو یا کڑکتا جاڑا، اسے بھی اس کلر والے میدان میں شنی ناگوں کے پیچھے دوڑنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ وہ نڈر سپیروں کی اولاد، سانپوں کو زیر کرنے کے بڑے بڑے دعوے رکھتا تھا —— اس کا ناگ تمام بستی میں، ایک ہی تھا۔ جس کو تمام دن دکھاتے پھرنا اس کا کام تھا

اس نے ناگ کو بین تو کیا، اپنے قدموں کی آہٹ پہچاننا بھی سکھا دیا تھا۔ اُس وقت ناگ بھی پٹاری میں کنڈلی مارے محو خواب تھا۔ اور حسنی سپیرا تو سپنوں کی دنیا میں پہنچ کر سب کچھ بھول گیا تھا۔ مزدور کی نیند اور بادشاہ کی نیند میں کہیں بہت زیادہ فرق ہے!"

سوتے میں بھی حسنی سپیرے کے چہرے پر ایک اطمینان اور سکون نمایاں تھا جب برگد کے درخت کے نیچے اس نے اپنی پٹار کندھوں سے اتاری تو ایسا معلوم ہوا تھا۔ کہ کسی بڑے فرض کو نہایت دیانت داری سے انجام دے کر سبک دوش ہوا ہے، گلی گلی کوچے کوچے پھرنے سے تھک گیا تھا چاہتا تھا ڈیرے کو پہنچنے سے پہلے ذرا ستالے جب ستانے کے لئے لیٹ رہا تھا تو برگد کے بڑے تنے کے پاس ایک نوخیز سرخ پھول جیسے زہریلے سانپ کا من ہوا دکھائی دیا۔ دیکھ کر للچا اٹھا، تھکن سے چور کہنے لگا۔ ڈیرے کو چلتے وقت اس پھول کو توڑ کر کان اور کن پٹیوں کے درمیان لگالے گا۔ اس وقت اس کی طبیعت نے ہلارہ لیا۔ گویا کوئی من موہنی سندر سپیری، اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی ہو۔ ستانا میں چھا جانے والے خمار سے اس کی آنکھوں کا رسیلا پن اور بھی سندر نظر آرہا تھا سپیروں کے نینوں کے رس کی تاب شہری لڑکیاں کہاں لا سکتی ہیں ——— ستانے سے پیشتر پھر اس نے بڑے اطمینان سے وہ نقدی نکالی جو اس نے ایک ایک گھر اور ایک در کے سامنے بین بجا کر

اور سانپ دکھا کر جمع کی تھی۔ نقدی کو کمر میں باندھ سستانے لگ گیا۔ پٹار میں ایک آئینہ لگا رکھا تھا جب اس میں اپنی شکل دیکھتا تھا، تو جھومنے لگتا تھا اپنے آپ سے متاثر ہو کر، شانوں کو پھیلا دیتا تھا۔ اس گھڑی بستی بھر کا محبوب اور شالہ معلوم ہوتا تھا۔ تمام بستی کا محبوب اور شالا حسنی ہی تو تھا —— اگر حسنی بستی میں نہ ہو، یا وہ بستی چھوڑ دے، تو بستی ہڈیوں کا ڈھانچ ہو کر رہ جائے، بستی کی الھڑ سڈول جسم والی لڑکیاں، سرخی مائل سانولے رنگ کا نکھار حسنی ہی کملیئے سمجھتی تھیں، پر حسنی اپنے سندر اور رسیلے پن کے سامنے کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ وہ جانتا تھا سپیرے کا سپوت، سانپوں سے، سی ناگوں سے کھیل لیتا ہے تو یہ غندی چھوکریاں اس کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہیں۔ اس وقت وہ محض وضع دار ہی نظر نہیں آتا تھا۔ بلکہ حسین اور ذی فہم بھی دکھائی دیتا تھا۔ حسنی انہیں خیالات کے تلاطم میں پاؤں پسارے سستاتا ہوا، پٹار پہ سر رکھے سو گیا خواب میں دنیا اس کے سامنے ایک سیر بین کی طرح اپنے منظر بدل رہی تھی۔ اس نے دیکھا بستی سے نکل کر وہ شہر کے ایک کوچے میں جا پہنچا ہے۔ پٹار کھلا ہے اور اس کا سی ناگ آرام میں خلل پیدا ہو جانے سے جھنجھلا رہا ہے وہ اسے بین کی مست الست سریلی لے سے راہ پر لا رہا ہے۔ اس کے اور تماشہ دیکھنے والوں کے درمیان یہ ایک ایسا وقت ہوتا جس کا اندازہ کچھ وہی کر سکتا تھا۔ اس وقت اسے یہ بات کبھی نہ بھولتی تھی۔ کہ یہ سانپ، یہ سی ناگ،

ناگوں کا بادشاہ، ہزاروں میں ایک ہے، اسے میرے باپ نے جان جوکھوں میں ڈال کر پکڑا تھا۔ اس کی بھینٹ کئی ماہر سپیرے چڑھ چکے تھے۔ یہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کے کاٹے کا نہ منتر ہے نہ جنتر۔ تقریباً گز سوا گز لمبا سانپ، سلاجیت سے بھی کالا، سپیرے کی آنکھوں کی طرح چمکیلا، اس کی رگ رگ میں زہر بھرا ہوا تھا۔

بین بج رہی تھی، سی ناگ کنچہ اُبھارے ناچ رہا تھا۔ حسنی سپیرے کو بین بجانے پر بڑا گھمنڈ تھا۔ سانپ کو چھیڑنے اور دق کرنے میں اسے ہمیشہ لطف حاصل ہوتا تھا۔ ناگ بے بس اور لاچار ہو کر منہ موڑ لیتا تھا۔ یہ کامیابی اور خوشی نیند میں بھی اس کے چہرے پر عیاں تھی۔ اس نے دیکھا۔ اس نے سانپ کو اپنے ارد گرد لپیٹ رکھا ہے، بازو میں ڈال گردن میں لٹکا لیا ہے۔ پھر چھوڑ دیا ہے۔ پھر چھیڑنے اور دق کرنے لگا ہے۔ اس وقت جب وہ خواب میں یہ سب خوش فعلیاں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ یکایک سکڑ کر اکٹھا ہو گیا۔ خواب میں سڈول اور مضبوط کلائیاں سانپ کے ڈسنے سے خون آلود نظر آئیں کھڑکیوں میں سے عورتیں، بچے، لڑکیاں جھانک رہی تھیں، پیسے، آنے، دونیاں حسنی سپیرے کے سامنے آ آ کر گر رہی تھیں، ایک شور تھا کہ چاروں طرف گونج رہا تھا۔ وہ اپنے وقار کو قائم رکھنے کے لئے تن گیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ کتنے خوب صورت اور غیر معمولی چہرے نظر آ رہے تھے۔ ایسے موقع پر

وہ خود بھی خوب صورت اور محبوب نظر آتا تھا ـــــــ روزانہ پھیری میں ایسے ایسے واقعات بھی پیش آئے تھے کہ تماشہ کے دوران میں عورتوں نے اپنے زیور اور دوپٹے اتار کر حسنی سپیرے کی نذر کر دیئے ہوں۔ اس وقت حسنی سپیرا، گردن اٹھا کر ناگ پر تھوک دیتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ تجھ دیوتا پر میں قادر ہوں۔ تجھ پر میرا قابو ہے۔ اس گھڑی وہ اس قدر بھرما جاتا تھا۔ کہ اپنی برتری کے سوا۔ روپے پیسے، زیور کپڑے ہر چیز کو بھول جاتا سپیرا نوجوان سپیرا چاہتا تھا۔ ان منظروں اور آوازوں میں ان قہقہوں میں بھرمایا ہوا۔ جوانی کی ترنگ اور عمر کی روشنی کو تباہ دے۔ ایک دفعہ ایسے ہی موقع پر ایک نوجوان لڑکی نے جوش میں آکر اپنی سونے کی جڑاؤ انگوٹھی اتار کر اس کے سامنے پھینک دی تھی، اسے زندگی میں کیا کچھ ملا تھا، اور کیا کچھ بھول گیا تھا۔ مگر اس انگوٹھی کو کبھی نہیں بھولا تھا۔

حسنی کو اپنے رہنے سہنے کا ماحول پسند تھا۔ وہ مطمئن تھا۔ اسے اس بات کا فخر تھا۔ کہ وہ سپیرا ہے اور سپیرے کی اولاد ہے۔ جب اس کے باپ نے یہ ناگ پکڑا تھا۔ تو اس کو دو ناگنیاں مارنی پڑی تھیں، جو راتوں کو ان کے جھونپڑے کے گرد آکر چکر کاٹا کرتی تھیں۔ اس وقت تمام سپیروں کو اپنی اور اپنے بچوں کی فکر لگ گئی تھی۔ کیونکہ کسی ناگ سے کہیں زیادہ زہر ان ناگنوں میں تھا۔ مشہور ہے۔ ناگنی اپنا انتقام کبھی نہیں چھوڑتی اور پھر وہ جس کا ناگ سپیروں نے پکڑ لیا ہو!

حسنی سپیرا اپنے ماں باپ کی ایک ہی اولاد تھا' اس کے کئی بہن بھائی لقمۂ اجل ہو چکے تھے یہی سبب تھا کہ بستی والے اسے سی بٹیا کہتے تھے سپیرے ناگوں کو ہمیشہ تخم کامل کہہ کر پکارتے تھے۔ سپیروں کی زندگی بھی ناگوں کی طرح لمبی ہوتی ہے کہتے ہیں جس طرح ناگن کے سینکڑوں بچوں میں سے ایک بچہ زندہ رہتا ہے۔ اسی طرح ایک کامل سپیرا بھی اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوتا ہے۔

حسنی سپیرا جب شہر سے ڈیرے کو واپس آتا تو ہمیشہ گاتا گنگناتا آتا۔ اس کی آواز میں ایک سوز اور ایک کشش ہوتی بستی کی لڑکیاں اس کے رس بھرے گانوں پر ریجھ جاتیں' وہ اس پر مان کرتیں' وہ سمجھتی تھیں اس مان سے حسن کو خوشی ہوتی ہے۔ مگر وہ یہ نہیں سوچتا تھا اور نہ کسی کو سوچنے کا موقع دیتا تھا۔ کہ وہ کبھی کسی پر ریجھ گیا ہے۔ اس کے من میں تو اس ناگ رانی کا تصور موجود تھا۔ جس نے اپنی حسین باہیں' ایک نہ ایک دن اس کے گلے میں ڈالنی تھیں۔ فضا پر سکوت کا عالم طاری تھا۔ اس کے خواب کا تسلسل نہ ٹوٹا' اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں تنہائی کے احساس نے زبردست کروٹ لی۔ ایک تھرتھراہٹ سی اٹھی۔ وہ سانپ سے کھیلتا' محسوس کرنے لگا۔ جیسے کسی سندر روپ سندرتا سے کھیل رہا ہے۔

بستی کی دوشیزہ لڑکیاں جب کبھی ناگ رانی کا طعن کرتی تھیں' تو وہ ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ موٹے موٹے لب کھول کر کہہ دیتا تھا۔ ناگ رانی

حسنی کے گلے میں اپنی باہیں ضرور ڈالے گی، وہ اس بستی میں آ کر رہے گی اس کے گلے میں ناگ دیوتا کا من لٹک رہا ہو گا۔ اس نے اپنی محبوبہ ناگ رانی کا تصوّر ضرور باندھ رکھا تھا۔ وہ اس کے متعلق سوچتا تھا۔ اور خاموش ہو جاتا تھا مگر فیصلہ نہ کر سکتا تھا۔ کہ وہ کون ہے، کہاں ہے اور اس کا حلیہ کیسا ہے، کیا وہ اس کے تخیل سے بلند ہے۔ یا اس کا تصوّر ہی تصوّر ہے ——؟

وہ شہر میں بازاروں کی بجائے گلیوں میں پھرنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ اسے پسند تھا کہ اس کا ناگ اہل ثروت اور سمجھ دار لوگ دیکھیں، اسے اپنے ناگ کی تعریف سن کر خوشی محسوس ہوتی تھی، جب ناگ گلے میں ڈالے تماشہ دکھا رہا ہوتا تھا، تو ایسا خیال کرتا تھا۔ کہ اس کی من موہنی ناگ رانی نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دی ہیں۔

سویا اور سستاتا ہوا سپیرا سرکتا چلا گیا۔ اس کی جوانی کا تناؤ اور بھی خوب صورت ہوتا گیا۔ کبھی کبھی اس شدت سے اضطراب محسوس کرتا تھا۔ کہ جیسے کوئی نازک ترین ہاتھ اسے گدگدی کرنے کے لئے بڑھ رہا ہے۔

حسنی سپیرے کا ناگ اپنی خصوصیات کی وجہ سے ایک ہی تھا۔ جب وہ چلتے ہوئے میدان میں آزاد تھا۔ تو ناگنیاں اس کی بُو پر مرتی تھیں، اس کے حسن پر جان دیتی تھیں۔ شی ناگ، سیاہ کالا ناگ زندہ دیوتا تھا۔ حسنی سپیرا ناگوں کی دنیا کا باشندہ، ناگ دیوتا پر قادر انسان، تھکان سے چُور بے فکری

کی نیند سو رہا تھا۔ نیند میں گاؤں کی دنیا، صحرا نوردی، شہر بازار، گلی کوچے، نازک نازک کلائیاں، رنگ برنگ کے لباس، نوجوان سہاگنیں، بوڑھی مائیں، دوشیزہ لڑکیاں، بچے اور بچیاں، حسین اور بد صورت چہرے، عجیب و غریب چیزیں دیکھ رہا تھا۔ ایک سیاہ پھن دار، زہریلی ناگن پٹار کا طواف کر رہی تھی، نوجوان سپیرا دنیا سے غافل، محوِ خواب، خدا جانے کن خوش کن اور غیر مرعوب حالات سے دوچار ہو رہا تھا۔ وُہ خواب میں مسکراتا ہوا، اور بھی پٹار پر چھا گیا تھا۔ سیاہ ناگن کنچہ اُبھارے پٹار کے طواف میں مصروف تھی جیسی سپیرے کا بھاری بھرکم جسم، کنڈلی مارے کسی بڑے خزانے کی رکھوالی کر رہا تھا —— سپیروں کی تمام دولت اور خزانہ، ناگ اور ناگنیاں ہی تو ہیں، سانپ خزانوں کے دیوتا ہیں، تو سپیرے ان دیوتاؤں پر قادر ہیں، سیاہ ناگن ناکامی کے احساس سے جھنجھلاتی، پھنکارے مار رہی تھی۔ وہ پٹار کے گرد گھومنے میں مصروف تھی۔ پٹار پر موت کا سایہ پھر پھرا رہا تھا۔ کائنات پر ایک سکوت چھایا ہوا تھا۔ دُور دُور کوئی متنفس جسے جینے کا حق پہنچتا ہے، اس زہر سے بجھی ہوئی دنیا میں نظر نہیں آتا تھا —— یہ حیوانیت یہ وحشت، بلند ترین جذبات کی صورت میں انجام پذیر ہو رہی تھی جیسی سپیرا چمکیلے بالوں اور سرخی مائل سیاہ رخساروں والا۔ بالکل ٹھنڈا اور سرد پڑ گیا تھا، سپیرے کی آنکھوں کا نور ناگن کی آنکھوں میں جا چمکا تھا —— فضا نے ایک چیخ سنی، بے خبر سوتے ہوئے

سپیرے کا تمام جسم اکڑ کر اکٹھا ہو گیا بستی کا محبوب، سپیروں کی اولاد۔ تخم کامل، ناگوں پر قادر انسان، تمام منتر اور سحر بھول گیا۔ اس کی جوانی آنکھوں کا نور، زندگی کے آثار سب پر ایک دائمی جمود چھا گیا۔ حسنی سپیرے کی سیاہ لٹوں میں، اب کوئی دلکشی اور جان باقی نہ رہی تھی، تمام رعنائیاں اور خوبیاں مرجھائے ہوئے پھول کی مانند شرمندہ خاک ہو کر رہ گئی تھیں، تمام کائنات لرزاٹھی تھی۔ سیاہ ناگن، جوڑے کھنچے والی، جو حسنی سپیرے کی موت کا باعث ہوئی تھی، خود بھی ناکامی سے بے بس ہو کر، پٹار کے نیچے سر دیئے سستا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا حسنی سپیرے کا زہر اسے بھی چڑھ گیا ہے، اسے بھی کسی شی ناگ نے ڈس لیا ہے! منہ سے زرد زرد رطوبت من کی صورت میں نکل رہی تھی، ایک سرخ قطرہ، جو اس کی زندگی کا جزو تھا جنگلی بیر کی مانند حسنی سپیرے کے لبوں پر پڑا، آہستہ آہستہ ماند پڑ کر سیاہ ہو گیا تھا۔ ناگن نے پھر پٹار کو جھنجھوڑا —— موت کی آخری انگڑائی لیتے ہوئے اپنے آپ کو حسنی سپیرے کے مردہ جسم پر ڈال دیا۔

سپیروں کو حسنی سپیرے کی موت پر ابھی تک تعجب ہے۔ اس کے آخری الفاظ کو معلوم کرنا، ان کی زندگی کا اہم مقصد اور فرض ہے۔ ان کا خیال ہے، وہ اوتار بن کر آئے گا —— بستی کی لڑکیوں کو بھی اس کی موت پر حیرانگی ہے، وہ ابھی تک اپنی خوب صورتی اور حسن کو حسنی سپیرے

کے رُوپ اور حسن کا پرتو سمجھتی ہیں ——— سپیروں کا بیان ہے، یہ ہماری آنکھوں کا سارا سحر اور جادو وہی کاجل ہے، جو ناگن کی آنکھوں اور حسینی سپیرے کے آخری الفاظ، کو پیس کر بنایا گیا تھا اور جسے ہم نے پشتوں کے لئے محفوظ کر لیا ہے!

پریم

شاہ بلوط کے سربلند درختوں نے اپنے سر جوڑ کر بازوؤں میں بازو ڈال دیئے تو سانس زور زور سے سنائی دینے لگی ـــــ دور جھیل کے کنارے راج ہنسوں نے اُڑنے کے لئے پر تول لئے اور وہ ایک گانے والے پرند کی طرح اِس دھنک میں سے لہراتے ہوئے گزر گئے، جو اندر دیوتا نے آکاش پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپسراؤں کے جھولنے کو ڈال رکھی تھی۔ قوس قزح کے اس پار ایک دنیا آباد ہے، یہ انہوں نے مجھے بتلایا تھا۔ وہاں امرت بہتا ہے جو دیوتاؤں کے چرنوں سے چھوتا ہوا دھرتی پر گرتا ہے۔ نیلا نیلا جل، نیلا نیلا آکاش، وہ جگہ دیوتاؤں نے اپنے رہنے کے لئے چن رکھی ہے، اس جگہ دیوتا ہی دیوتا رہتے ہیں، دن رات اپنی تپسیا میں مصروف!

نیلے نیلے آکاش پر جھکی ہوئی ہواؤں میں جب انہوں نے میرے زرد اوڑھنے کو اڑتے ہوئے دیکھا تو کہا یہ میگھ دھوت کا ٹکڑا ہے، جو ممتیتی کے نام پیغام لئے جا رہا ہے میری نظریں جھک گئی تھیں، میرا دایاں بازو کھل گیا تھا اور میں اپنے اوڑھنے کو سمیٹنے لگی۔ میرے بال میرے شانوں پر لہرانے لگے جن کو دیکھ کر انہوں نے کہا۔ یہ جٹا دھاری کی یاد میں کالے کالے ناگ لہرا رہے ہیں۔ انہوں نے میرے مکھ کو مدھ بھرا کٹورا کہا اور یہ بھی کہا کہ دنیا کی سندرتا نے اس پر بھینٹ چڑھنا ہے یہ کہہ کر وُہ زور زور سے ہنسنے لگے۔ میں شرم سے جھکی کی جھکی رہ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پہلی بار کسی نے مجھے دیکھا اور چھوا ہے۔ اُس وقت ان کی آواز میں دیوتاؤں کا سا رس اور شکتی تھی، ان کی مدھ بھری آنکھیں گنگا جل سے نہائی ہوئی نظر آ رہی تھیں، ان میں روشنی تھی اور پریم جیسے وُہ مجھے ہی دیکھ رہے ہیں، اور ان کی نظر میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔

سورج تیزی سے نیچے ہی نیچے جا رہا تھا۔ اور ہلکی ہلکی سنہری چادر دھرتی کے تمام سینے پر بچھی ہوئی معلوم دے رہی تھی، ہوا درختوں کے درمیان سے گذرتی تھی تو تمام درخت خوشی سے جھومنے لگ جاتے تھے۔ پتے مسکراتے ہوئے ایک خوش آہنگ گیت گاتے تھے، دلکش منظر پہ میری آرزوئیں ابھر آئیں۔ مگر میں نے سب کچھ دیکھ کر بھی اپنی مسرت کو چھپانے کی غرض سے ذرا سا مسکرا کر ان کو دیکھ لیا۔ گو میری مسکراہٹ دبی ہوئی تھی مگر

انہوں نے مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اور بلند آواز میں دیوتاؤں بالکل دیوتاؤں کی طرح کہا —— وہ دیکھو نیچے جھیل کے اندر سفید کنول کے پھول اپنی بہار دکھلا رہے ہیں، یہ پھول کبھی نہیں مرجھاتے، جب پورن ماشی کا چاند اپنے پورے جوبن پر ہوتا ہے اور جھیل برکھا کے پانی سے لبالب بھر جاتی ہے، تو یہ سفید کنول کے پھول کھلتے ہیں، چندرما کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ اس وقت چاندنی بے خوف و خطر اس پھول سے اس پھول تک رقص کرتی اور ناچتی ہوئی چلی جاتی ہے —— وہ دیکھو دور جھیل کے کنارے راج ہنس بسیرا کرنے کی غرض سے اتر رہے ہیں، سورج کی سنہری شعاعیں ان پر پڑ رہی ہیں، وہ کتنے بھلے معلوم دے رہے ہیں، جیسے جھیل مانسرور کا پوتر جل پی کر آ رہے ہیں۔ راج ہنس بڑی بڑی بلندیوں پر اڑتے ہیں، ان کا پریم بھی اتنا ہی بلند ہے، جتنا کہ وہ بلند اڑتے ہیں، دیکھو کس طرح سینہ ابھارے اپنے جیون کی آشا میں مست تنتے چلے جا رہے ہیں، وہ اپنے من کی جو یا اور من کے سکھ میں کس قدر مگن ہیں، یہ اس وادی سے آئے ہیں جہاں دیوتا ہی دیوتا آباد ہیں، اور وہاں سورگ ہی سورگ ہے، وہاں پوتر جل دھارا بہتی ہے۔ جو من کی جوت جگاتے بہتی ہے پجاریوں کا عقیدہ ہے، ان کا دھرم ہے وہ مدتوں سے یہی کہتے چلے آئے ہیں، وہ موتی مونگے جو اس پوتر جل کے نیچے کھلتے رہتے ہیں جنہیں راج رانیاں اور راج کنیائیں اپنے آشا بھرے

سپنوں پر مچلتے بکھرتی ہیں، دیوتاؤں کی مالا سے ان کے مکٹ سے ان کی جٹاؤں سے گر کر آتے ہیں، اور دھرتی پر پھیل جاتے ہیں، تاکہ دیوتاؤں کی یاد اور پریم میں کسی قسم کا فرق نہ آئے۔

میرا اوڑھنا پھر اُڑنے لگا میرا سر ننگا ہو گیا۔ میں بے بس سی ہو رہی تھی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ میری کمر میں ڈال دیا، میں پسینہ پسینہ ہو گئی۔ میں نے چاہا کہ ان سے اپنا آپ چھڑا لوں، مگر میرے من کی جوت نے جو میرے اندر چمک اٹھی تھی۔ میری تمام کوششوں کو بیکار بنا دیا — اور میں ان کی گرفت سے نہ نکل سکی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لگاتے گئے۔ ہم بہت دُور، بہت دُور، اُوپر ہی اُوپر بالکل خاموش کہیں سے کہیں نکل گئے۔ یکایک ان کی آنکھوں میں روشنی دوڑ گئی۔ اور انہوں نے مجھے اور بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ کہنے لگے۔ ہم ایک دوسرے کے قریب تر ہو گئے ہیں میں اس خوشی میں ایک یادگار قائم کرونگا۔ میں ایک نئی دنیا آباد کرونگا۔ سورگ سے بھی نرالی اور اچھوتی ایسی دنیا جو آکاش سے بلند اور چاند ستاروں سے زیادہ روشن ہو گی۔ اس میں پریم ہی پریم ہو گا — دنیا پر ایک سکوت چھا گیا۔ اور میں اس سکھ سنسار کی یاد میں کھو گئی۔

ہم خوشی میں بسے ہوئے خوشبوؤں میں سے گزر رہے تھے، ہر طرف سوسن، چنبیلی اور مالتی کے پھول کھل رہے تھے، وہ اپنی دھن میں مجھے لئے جا رہے تھے میں رنگ برنگ کے پھول توڑتی رہی اور ایک مالا بناتی رہی۔ ان کی کمان سے

کہیں لمبی، اور دلکش، جب یہ مالا تیار ہو چکی۔ تو میں نے ان کے گلے میں ڈال دی وہ بولے، پجاری سمرن کرینگے، دیوتا اس کا جاپ کرینگے۔

بادلوں سے بلند نیلے آکاش میں بہت دُور اُوپر ہی اوپر میں نے دیکھا ہر طرف پرارتھنا ہی پرارتھنا ہو رہی ہے۔ پوتر جھل دھارا پر، چٹانوں پر، اپنے اپنے استھان پر دیوتا سمادھی لگائے دم سادھے دنیا کی نجات کے لئے پرارتھنا میں مصروف تھے، بھگتی کے پریم رس سے ان کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی صبح ہونے کو تھی نیلگوں آسمان پر شفق کی سرخی پھوٹ نکلی تھی۔ دُور پورب کے پہاڑ پر مہیشور کی ترشول گڑھی تھی جس میں سے سورج کی تیز تیز شعاعیں چھن چھن کر آ رہی تھیں —— وہ میرے پاس آئے ہیں پوتر جل میں میٹھی اپنا زرد اوڑھنا اوڑھے، پوتر دھارا میں یوں سمٹی جا رہی تھی، جیسے صدف میں موتی بند ہو جائے!

افق کے اس پار دیوتا ناچتے ناچتے تھم گئے تھے۔ انہوں نے اپنی پرارتھنا ختم کر دی تھی۔ پوتر جل میرے گرد ہالے بنائے، چکر کھاتا بہہ رہا تھا۔ ایک سرسراہٹ سی پیدا ہوتی۔ میرے بدن کو میرے عریاں سینے کے ابھار کو کسی نے چھپا میں سستا رہی تھی۔ جیسے ابھی ابھی اشنان سے اٹھی تھی۔ نتھرا ہوا جل پریم بھری لے میں گزر رہا تھا میری آنکھوں نے میرے مدھ بھرے نینوں نے "ایسا نیلا" ایسا دلفریب آکاش کبھی نہیں دیکھا تھا —— وہ بازوؤں میں بازو ڈالے، مسکراتے ناچتے مجھے آگے ہی آگے لئے جا رہے تھے، اور کہہ رہے تھے —— ہم ایک

دنیا آباد کریں گے، خوشبوؤں سے بسی ہوئی، رنگوں میں رنگی ہوئی، جہاں پریم ہی پریم ہوگا۔

سرشت

یہ ایک دھندلی سی شام کا واقعہ ہے جو تپتے ہوئے صحراؤں کی یاد کو تازہ کرتی تھی۔ شام کے سکوت میں جب کان کسی آہٹ سے چونک اُٹھتے، تو یہی معلوم ہوتا تھا، تھکے ہارے آہو، اپنی اپنی قیام گاہوں کی طرف لوٹ رہے ہیں، برسات کا موسم ختم ہو چکا تھا۔ بادلوں کے ٹکڑے جو اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے ایسے نظر آتے تھے جیسے پرندے پر تولے بستیوں سے دُور اوپر ہی اوپر اُڑے چلے جا رہے ہوں، ہواؤں میں خنکی اور نمی آچکی تھی ——— شہر کا یہ حصہ گو بلند عمارتوں اور شاہی مقبروں سے چنا گیا تھا۔ مگر بستی کے رہنے والے تہذیب کے ان نشانوں کو اپنی شایانِ شان نہ سمجھتے تھے، وہاں نخوت نام کو نہ تھی اور جو کچھ تھا وہ ایک وجدانی کیفیت تھی۔ یہ جگہ قبائل کے لوگوں نے جو زمانے کی نیرنگی سے یہاں

آ بسے تھے اپنے لئے چن لی تھی۔ انہوں نے یہ انتخاب اپنے لئے رحمتِ حق تصور کیا تھا۔ وہ بُرا بھلا دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے یا نہیں۔ انہیں وہاں کچھ راحت نظر آتی تھی یا نہیں، اس کا سوال ان کے درمیان موجود نہ تھا۔ وہ اصول کے پابند نیک سیرت سیدھے سادے انسان تھے۔ ان کی پیشانیاں نور کی مانند چمکتی تھیں، جو وہاں رہتا تھا۔ ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا۔ ایک دوسرے کا بھائی معلوم ہوتا تھا۔

شہر کی بڑی بڑی کشادہ سڑکوں اور گاؤں کی تنگ پیچ دار پگڈنڈیوں سے آنے والوں کی نگاہیں ان بلند اور رفیع الشان عمارتوں اور گنبدوں پر پڑتی تھیں اور ان کی انتھاہ میں اُتر جاتی تھیں، جہاں بادشاہ اور بادشاہوں کی اولاد آرام فرما رہی تھیں —— بستی کی طرف آنے والوں کو یہ خوشی تھی، کہ انکے آرام کرنے کی ساعت دن بھر کے واقعات اور قصّے کہانیاں کہنے کا وقت قریب آ رہا ہے جو آتا تھا ایک ہی مرکز کی طرف چلا آتا تھا۔ اکثر اوقات وُہ ایک دوسرے کے شانوں پر ہاتھ رکھے بازوؤں میں بازو ڈالے گھڑی دو گھڑی اس قلندر کا تماشہ دیکھنے کھڑے ہو جاتے تھے جو اس گرد و نواح میں اکثر چکر کاٹتا رہتا تھا۔ ہر شام کو بستی میں تماشا کرنا قلندر کا معمول تھا۔ وہ آج بھی حسبِ معمول تماشا کرنے میں محو تھا۔ وہ دنیا بھر کی شکایتیں پیٹ بھرنے کے لئے کر رہا تھا۔ کوئی اسے یہ کہنے کی بھی تو جرآت نہ رکھتا تھا کہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ آخر تمہارا مقصد کیا ہے —— قلندر کی آنکھوں میں سوائے

جوش اور سُرخ سُرخ ڈوروں کے کچھ نہ تھا۔ اس کی تمام شکایتیں جو اسے دنیا کے خلاف تھیں ہزار چیخ و پکار کے بھی تسکین کا باعث نہ بنتی تھیں اور جو وہ شکایت کے طور پر کہتا تھا محض پیٹ پالنے کا ڈھب معلوم دیتا تھا اس کے کردار کا اگر سرسری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ اس کا خود ہی باعث ہے پسینے سے تر اور میلے کچیلے کپڑے اسے حقیر ثابت کرنے کے لئے کچھ کم ثبوت نہ تھے۔ اور جو وہ بیان کرتا تھا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ سب کچھ اس کی عادت میں شامل ہو گیا ہے۔

ایک معصوم لڑکی ذرا دور کھڑی آنے جانے والوں کی بجائے اپنے مالک کا منہ تک رہی تھی۔ وہ ہر لمحہ اس ٹوہ میں تھی کہ اس کے لئے اس کے مالک کا کیا حکم ہے۔ اس کے سر کے بال سرحدی بچوں کی طرح کٹے ہوئے چمکتی ہوئی پیشانی پر اس کی معصومیت کا یقین دلاتے رہتے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ساز تھا۔ دیکھنے میں بالکل ٹوٹا ہوا ناکارہ، مگر جب وہ اسے اپنے مالک کے حکم سے چھوتی تھی تو اس میں سے نغمے نکلتے تھے درد و کرب سے بھرے ہوئے دل چھید دینے والے، سینہ میں ہیجان پیدا کرنے والے، وہ ایسے نغمے تھے جنہیں سمجھنے اور برداشت کرنے کے لئے ذہانت درکار تھی۔ اور اس خوشی سے جو اس سے پیدا ہوتی تھی اس سے لذت اندوز ہونے کے لئے دل کا احساس مند ہونا ضروری تھا۔ لڑکی ایک پُرسوز گیت گا رہی تھی۔ مجمع پر عجیب بے خودی طاری

تھی۔ ایک اندھا لوگوں کو دھکیلتا، ٹٹولتا ہوا ہجوم میں داخل ہوا اور آواز میں بے بسی ظاہر کرتے ہوئے، جیسے کوئی یاد اس کے اندر چمک اٹھی ہو، بولا "گانے والی کے منہ پر ہاتھ رکھ دو۔ یہ پُر درد آواز دکھ پہنچانے والی ہے"۔ —— مجمع میں اور بھی اضافہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ آنے والوں نے، تماشا دیکھنے والوں نے اندھے کو بُرا بھلا کہتے ہوئے بے دردی سے باہر دھکیل دیا۔ اندھے کے اندر کی دنیا دوتی تھی۔ خدا نے اس کی بینائی چھین کر اسے ایک ایسی نعمت بخشی تھی جس کے اظہار کا اس کے پاس ذریعہ موجود نہ تھا۔ کسی نے دور کھڑے جو قلندر کو مدت سے جانتا تھا کہا "آج قلندر پہلے سے مختلف نظر آتا ہے"۔ لڑکی برابر گا رہی تھی۔ تماشا دیکھنے والوں نے اس قدر شور مچا رکھا تھا کہ کچھ سنائی نہ دیتا تھا لیکن اسے گانے میں ذرا بھی تساہل نہ تھا۔ وہ اس وقت یقیناً ایک ماہر مغنی کی طرح اس بخشش سے جو اسے قدرت کی طرف سے ملی تھی، اپنے گانے میں دنیا کی تنگ دلی کا مضحکہ اڑا رہی تھی۔ وہ وہی کچھ کہتی تھی جو قلندر کا مقصد تھا

قلندر دیکھنے میں تندرست، نوجوان سب کچھ دکھائی دیتا تھا۔ اس کے سفید سیاہی مائل بال، بڑی بڑی اور چھپی چھپی آنکھیں گرد و غبار سے اٹا ہوا چہرہ ان سب میں تمکنت کا ایک نشان موجود تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جس کے ضائع ہو جانے کا غم اسے اس دنیا میں چین نہیں لینے دیتا۔ اس کی نگاہیں جب ہجوم پر اٹھتی تھیں، فوراً جھک جاتی تھیں اور اس طرح کچھ کہتا نظر آتا

تھا۔ گویا ہر ایک اس کی اندرونی کیفیت اور داستانِ حیات سے واقف ہے
مجمع اور بھی بڑھ گیا۔ قلندر کی آواز میں درد اور پشیمانی کا احساس جمع ہو گیا تھا۔
جو اس کی حرکات سے واقف تھا۔ ہر آدمی محسوس کر رہا تھا۔ کہ ہم نے اس کو سمجھنے میں
غلطی کھائی ہے۔ وہ قلندر تھا۔ اس میں قلندری شان چمک اٹھی تھی۔ اپنے
بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، تدبر کے لہجے میں بولا۔ مجھے بستی بستی پھرتے اور شہر
شہر گردانی کرتے برسوں گزر گئے۔ کہیں بھی اس عذاب سے جس سے میں نجات حاصل
کرنی چاہتا ہوں چھٹکارا نہ ہو سکا، بھائیو میں ایک ایسے عذاب میں مبتلا ہوں
جسے میری موجودہ ذلت بھی ختم نہیں کر سکتی۔ میں گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں
گداگری کرتا پھرتا ہوں میں نے بھلا دیا ہے۔ کہ میں کیا تھا۔ کیا ہوں اور کہاں
سے آیا تھا۔ اور کیا کر رہا ہوں، مہینوں بھوک اور پیاس کی شدت سے نڈھال
مارا مارا پھرتا ہوں مجھے کوئی نہیں جانتا اور نہ میں کسی کو پہچانتا ہوں۔ باوجود
ہزار کوشش کے یہی معلوم ہوتا ہے جو ہے وہ مجھے جانتا ہے اور مجھ سے
میرے اعمال سے میرے خاندان سے کچھ نہ کچھ اس کا تعلق ہے —— یہ بچی
میری لڑکی ہے، میں نے اسے بڑی محنت سے پالا ہے۔ برسوں سے لوگ یہی
سمجھتے چلے آئے ہیں۔ کہ میں نے اس کو اس کے ماں باپ سے جدا کیا ہے۔ میں ظالم
نہیں ہوں کسی کی اولاد کو اس سے چھین کر بھیک مانگنے کا ذریعہ بنانا بڑا پاپ
ہے۔ میں نے لوگوں کو جو مجھے بھیک دیتے اور حقارت سے دیکھتے ہوئے میرے

پاس سے گذرتے ہیں، ان میں سے اکثر کو یہ کہتے سنا ہے۔ یہ لڑکی کتنی اچھی کتنی معصوم ہے، نامعلوم اس گنوار کے ہاتھ کہاں سے لگی ہے۔ میں ہر طرح سے دیانت سے لوگوں کو اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کرتا ہوں کہ یہ لڑکی میری ہی ہے، میں نے اسے بڑی محبت سے پالا ہے"!

قلندر کی صاف گوئی پر مجمع میں سے کبھی کبھی قہقہوں کی آواز ایک شور کی صورت میں اٹھتی تھی۔ مگر قلندر کی بلند آہنگ آواز سب پر چھائی ہوئی تھی وہ اپنی دھن میں جو چاہتا کہے جاتا تھا" لوگو یقین جانو۔ میں نے اسے اس طرح سے کھڑے ہو کر ناچنا، گانا کچھ بھی نہیں سکھایا، اس کی سرشت اور فطرت ہے، یہ وراثت کا مظہر ہے، جو میرے اعمال کا نتیجہ ہے —— "میری بچی کوئی نہیں جانتا اسے ابھی کیا کچھ بننا ہے، جب یہ ننھی سی جان بلک رہی تھی اور رات کی سیاہی میں اس کی معصوم پیشانی چمک رہی تھی۔ میں نے اسے دلاسا دے کر سلا دیا تھا اور کہا تھا۔ میں تیری حفاظت کرونگا۔ اس وقت معصوم کی محبت نے میرے تمام وحشیانہ خیالات کو دور کر دیا تھا۔ میری سرشت بدل ڈالی تھی اس وقت میری آنکھوں میں ایک نور تھا" غیرت غیور کونک رہی تھی۔ مسرت انگیز شعاعیں ہم دونوں کے ارد گرد رقص کرتی نظر آتی تھیں —— قلندر نے پھر اپنی نظریں، جن میں محبت کا احساس چمک رہا تھا۔ لڑکی پر ڈالیں، لڑکی نے بھی اپنی غمگین آنکھوں کو اپنے مالک کے جواب میں

اپنے مالک کی طرف اٹھا دیا۔ وہ زخم خوردہ گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا، لوگو دنیا والو، اولاد کی محبت صرف تمہارے ہی لئے نہیں، اس پر ہم غریبوں کا بھی حق ہے یہ میری بچی ہے، میں نے اسے بڑی محبت سے پالا ہے۔" قلندر کا بڑا سا سر جھک گیا۔ تھوڑی دیر تک اس پر خاموشی طاری رہی۔

"یہ میری لڑکی ہے اس کا کوئی نام نہیں۔ بغیر ماں اور نام کے ایک معصوم اور مشکوک لڑکی۔ اس کی آواز اور گانے میں اس کی ماں کا سا لوچ اور خوش آوازی ہے، وہ اس کی ماں تھی ——— میرا نام و نسب میرا خاندان ان سب نغموں کی یاد یہ میری لڑکی باقی رہ گئی ہے۔ اس کی ماں جس نے میرے دل و دماغ پر فتح پائی تھی۔ کبھی مسرت اور راحت کا گہوارہ تھی۔ مجھے کتنا دکھ ہوتا ہے جب اس کی لڑکی ناچتی اور گاتی ہے۔ اندھے نے ٹھیک کہا تھا اس لڑکی کے منہ پر ہاتھ رکھ دو، اسے ضرور کوئی دکھ پہنچا ہو گا۔ وہ دکھی تھا۔ اس نے بھی ضرور کسی سے محبت کی تھی۔ کتنے لوگ ہیں جو یہ جانتے ہیں، کہ اندھے لولے فقیر اور گداگروں میں بھی دل ہے ——— میں نے مہینوں نہیں برسوں سوچا تھا کہ اسے کہیں فروخت کر دوں، اسے کسی کو دے ڈالوں تاکہ اس کی پرورش اچھی طرح ہو اور وہ بہترین زندگی بسر کر سکے، میرا ماضی و مستقبل دونوں ختم ہو چکے ہیں۔ یہ اپنی ماں کی یاد ہے اس سے دکھ بھی ہے اور تسکین بھی، یہ میری بچی ہے میں نے اسے بڑی محبت سے پالا ہے!

عورت کتنا خوبصورت تصور ہے، وہ ہمیشہ اپنی فطرت سے جنگ کرتی ہے اور اپنی ہی فطرت سے محبت کرتی ہے، اس لڑکی کی ماں کو میں نے اپنی زندگی کا ساتھی چنا تھا۔ عورت کو عورت کی حیثیت سے مطالعہ کرنے کا موقع انسان کو بہت کم ملتا ہے، جب وہ خود اس سے محبت کرتا ہے، تو وہ خود نہیں جانتا کہ وہ کیا چاہتی ہے اور اس کی محبت کا کیا ثبوت ہے۔ جب کبھی عورت پر ہم کھل کر تنقید کرتے ہیں، تو وہ گذرے ہوئے واقعات کے آئینے میں ہمیشہ عریاں نظر آتی ہے ——— بھائیو یہ لڑکی اپنی ماں کی محبت کی یاد ہے عارضی ہو یا دائمی عورت ہمیشہ اپنی حفاظت مرد کی آغوش میں پاتی ہے وہ رحم چاہتے وقت اپنے آپ کو مرد سے زیادہ کمزور ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے، اور یہی اس کی کامیابی کا راز ہے، جب میں اس لڑکی کی ماں کی محبت میں گرفتار ہوا تو وہ سیرا کی مشہور ترین رقاصہ تھی۔ میں اس کی پہلی ہی نظر میں ایک ناقابل برداشت آرزو میں اُلجھ گیا تھا۔ میں خود سیرا کا رہنے والا ہوں، وہ سیرا کے پاس کے ایک گاؤں سے آئی تھی کبھی اس بات کی نوبت نہیں آئی تھی کہ میں پوچھوں وہ کون ہے اور کس طرح اس نے یہ زندگی اختیار کی تھی اور کس طرح گانے میں اسے شہرت حاصل ہوئی تھی۔ اس کے ہاں امیر، رئیس، شاہزادے، قسم قسم کے لوگ آتے تھے۔ اس کی گفتگو میں کوئی خاص دلکشی نہ تھی۔ پر لوگ پھر بھی اس کے دلدادہ تھے۔ وہ بہت سادہ واقع ہوئی تھی۔ اور یہی صفات جو اس کے اندر بہت

زیادہ موجود تھیں۔ اس کے معصوم ہونے کا یقین دلاتی رہتی تھیں۔ لیکن جہاں تک میری ذہانت کا تعلق ہے' اس کے عجز و انکسار میں ایک ملعون جذبہ گھات لگائے میری طرف تکتا رہتا تھا۔ مجھے اس سے گہری محبت ہو چکی تھی اور میں اس کا اظہار کرنے میں کبھی چوک نہ کرتا تھا۔ اور وہاں کی قابلِ نفرت فضا کے باوجود اور خود اس کی لغزشوں کے ہوتے ہوئے۔ اس کی جدائی گوارا نہ رکھتا تھا۔ اس نے بھی اپنی تمام شہرت کو میری جسمانی خوبصورتی پر بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ میرا تعلق ایک شریف خاندان سے تھا' اور وہ محض ایک گانے والی' میری تمنّا نے اس کے تمام عیوب کو اپنے آپ میں چھپا لیا' وہ دنیا میں ایک ہی عورت گذری ہے جس کو میں نے کھلے الفاظ میں کہا تھا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں" - یہ الفاظ میں نے اس عورت سے کہے تھے جس نے ایک دنیا کا دل اپنی مٹھی میں قابو کر رکھا تھا ——— وہ عورت تھی' ایک خوشگوار خواب' خوب صورت کپڑوں میں ملبوس رنگین و لطیف جسم! ———

"سیرا کے فقرا دے' تو نے ایک رقاصہ کو کتنا بڑا افتخار بخشا ہے' اس کا عیش و آرام' حیات' موت سب کچھ تو ہی ہے' وہ تیری ہے' وہ تیرے ہی لئے رہے گی" ——— یہ الفاظ اس نے ایک روز بڑے جوش اور تمکنت سے کہے تھے' اس کی خادمہ پاس ہی کھڑی تھی نہیں معلوم بانو' اس کے ہاں کب سے تھی۔ وہ ایک غلام نسل سے تھی۔ اسے سوڈان سے لایا گیا تھا۔ خادمہ نے اس

کی طرف آنکھوں کو کچھ سہمے سہمے اٹھایا تھا۔ پھر تقاضہ اپنے جذبات سے مجبور بہت کچھ کہہ گئی ، وہ بولی، بالو تو اس کیفیت سے نہیں گذری ہیں ایک رومان کی صورت میں دنیا کا سیاہ و سفید دیکھ رہی ہوں" ---- جب کبھی میں افسردہ ہو جاتا، تو وہ میرے غم کو اپنے دلکش نغموں سے خوشی میں بدل دیتی، وہ اپنے نغمۂ سے مجھ میں اس طرح تبدیلی پیدا کر دیتی جس طرح خالق نے مٹی کے تودے میں نغموں کے ذریعے زندگی بخشتی تھی،

وہ جب کبھی مجھ سے لپٹ جاتی اس وقت میری خاندانی عزت، دولت اس کے قدموں میں پڑی اس کے رحم کو اپنا نگہبان تصور کرتی، تم اپنے تصور کو کہاں تک اس عورت کے سمجھنے میں بلند کرو گے، جس نے میرا دل موہ لیا تھا۔ وہ میری محبوبہ تھی۔ میں اسے دل سے چاہتا تھا۔ وہ خوشی جسے ایک توانا مرد لطفِ زندگی سے تعبیر کرتا ہے، اس کے متبسّم لبوں پر رقصاں رہتی تھی، وہ روشنیاں جسے ہم نور اور تجلّی کہہ کر پکارتے ہیں، اس کے خوبصورت بالوں میں سے جھانکتی دکھائی دیتی تھیں، میں نے اسے زندگی کا سہارا سمجھا تھا۔ یہ اس کی لڑکی ہے یہ وراثت کے خون میں نہائی ہے، میری معصوم بچی، میں نے اسے بڑی محنت اور محبت سے پالا ہے!-----

ہم دونوں کو زندگی بسر کرتے ہوئے ایک عرصہ گذر گیا، اب میری محبوبہ میرے اندر وہ قوت پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوتی تھی جو کچھ عرصہ پہلے

میرے رگ و خون اور جذبات میں رواں تھی۔ میں اس کے ظاہری حسن اور نمائش پر اپنی خاندانی شرافت اور اپنی خوبی کو جو مجھے ورثہ میں ملی تھی قریب قریب ختم کر چکا تھا۔ میں یہ بھول گیا تھا۔ کہ میں کیا تھا ——— اور کیا ہوں۔ کیونکہ میری دیکھنے اور سوچنے کی قوتیں اس قدر ناکارہ ہو چکی تھیں کہ میں روز روشن میں اس کی سیاہ کاریوں کو برداشت کرنے لگ گیا تھا۔ میں اس کے لئے سب کچھ دے چکا تھا مگر اس کا اپنا جذبہ جس میں ایک لہر سی آتی تھی ختم ہو کر، اب کسی اور طرف بہہ گیا تھا اگرچہ، بانو ہمیشہ مجھے اس کی محبت کا یقین دلاتی رہتی تھی۔ مگر وہ بانو ہی تھی جس نے میری محبوبہ کو مجھ سے جدا کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی، باوجود ہزار کوششوں کے بھی میں اپنے آپ کو اس شیطانی ماحول سے نہ نکال سکا۔ یہ دیکھو میرے دائیں رخسار پر ایک گہرا نشان ہے، یہ چھڑی کا نشان ہے۔ یہ میری محبوبہ کے آشنا کا لگایا ہوا ہے۔ جس نے میری عزت پر ڈاکہ ڈالا تھا، یہ وہی جگہ ہے جسے میری محبوبہ ہزار بار چومتی تھی اور اس کی پیاس نہ بجھتی تھی۔

"میں ایک سوداگر کا لڑکا ہوں، میں کبھی سیرا کا شہزادہ کہلاتا تھا میرے باپ نے ملک کی سیر کی تھی۔ اس نے مجھے بہت اچھی طرح پرورش کیا تھا۔ میں نے اس ماں کا دودھ پیا ہے جس کا باپ جنگ میں مارا گیا تھا۔ سیرا وہ سرزمین ہے جہاں کی مائیں اپنے بچوں کو راہ حق میں قربان ہونے کے لئے پالتی ہیں۔ اور وہ اپنے دودھ پیتے بچوں کو جہاد کی کہانیاں سناتی ہیں۔"

مجمع میں کچھ شور بلند ہوا، قلندر بولا ۔۔۔ قلندر کی ممتا جاگ اُٹھی ہے اُس پر خاندانی روایات اور وطن کی یاد نے غلبہ پا لیا ہے۔ اس نے اس سرزمین پر پرورش پائی ہے جہاں لوگ سچ کے سوا کچھ نہیں جانتے، ان کا مرنا راہِ حق میں مرنا ہے، ان کا جینا اپنے الفاظ کے پاس کے لئے جینا ہے جب میں جوان تھا سیرا کی ساری مخلوق مجھ سے محبت کرتی تھی، میں نے یہ زخم اپنی محبوبہ کی غداری کی وجہ سے کھایا تھا۔ اس میں میری غیرت کا سوال تھا، آہ میری غیرت کو ختم کرنے میں میری محبوبہ نے کس قدر فریب اور مکر سے کام لیا تھا۔ دنیا کی ہر مسرت اور لذت غم کی طرح مہلک ہے۔ اور گذشتہ کی یاد ہی مہلک ہے وہ ایسی ہی مہلک ہے جیسے کسی بد سرشت کی سرشت!" ۔۔۔ ساز خاموش تھا۔ لڑکی نے اپنا چہرہ جھکا رکھا تھا اس کی نیم جان آنکھیں پھٹی پھٹی نظر آ رہی تھیں وہ بے حس و حرکت کھڑی مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔

ہر روز پیٹ کی خاطر قصے بیان کرنا قلندر کا معمول ہو گیا تھا۔ لوگ اس کی چرب زبانی کو روزی کا ذریعہ سمجھتے تھے، مگر آج کی داستان بالکل اس کے دل کی کیفیت تھی کوئی نہ جانتا تھا۔ کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کس لئے بیان کر رہا ہے اس کا مقصد کیا ہے۔ لڑکی حسبِ معمول سامنے کھڑی تھی، وہ اس کی یاد میں اضافہ کرنے میں مدد دے رہی تھی، وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ اس کی لڑکی تھی

آج کی شام یقیناً ایک انوکھی شام تھی۔ بستی والوں کا غیر معمولی اجتماع قلندر کی

دانستان میں بہت گہری دلچسپی لے رہا تھا، قلندر بولا۔ "اندھا سچ کہتا تھا کہ گاگا نے اِلی کے منہ پر ہاتھ رکھ دو۔۔۔۔۔۔ وہ ضرور کسی شدید ضرب سے تڑپ اٹھا تھا۔ اس نے بھی ضرور کسی سے محبت کی تھی۔ اس کے دل کو بھی یقیناً ٹھیس پہنچی تھی کتنا اچھا گاتی ہے کتنی خوبصورت اور دل کش اداؤں سے ناچتی ہے۔ یہ بالکل اپنی ماں کا نمونہ ہے۔ اس کے ہر فعل میں ماں کی سرشت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس کی ماں میری محبوبہ تھی۔۔۔۔ بازار میں بیٹھنے والی!۔۔۔۔ میراکی زفاعہ"۔

قلندر کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک عود کر آئی۔ اس کے بھاری زبردست ہاتھ لڑکی کی گردن میں حمائل تھے، وہ اپنی لڑکی ایک ایک کو دکھلاتا پھرتا تھا۔ وہ بولا۔ "اس کی ماں میری محبوبہ تھی میں نے اس سے محبت کی ہے، وہ مجھے ایسی ہی عزیز تھی۔ جیسے محبوبہ عزیز ہوا کرتی ہے۔ اسے مرے ہوئے برسوں گذر چکے ہیں جس طرح میں اس کی زندگی کا باعث تھا۔ اسی طرح اس کی موت کا باعث ہوں۔ اس نے میری خاندانی شرافت، میری عزت، میری غیرت، میرے احساسات، میری دولت، میری ہر چیز کو قتل کر دیا تھا۔ وہ واجب القتل تھی۔ "بازاری عورتیں محبت کی قیمت وصول کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے ان کے ہاں ابھی تک محبت کا معیار قائم نہیں ہوا"۔

"اس کی موت ایک راز تھا، یہ راز میں نے برسوں سینے میں چھپا رکھا تھا، اور آج بھی انتہائی کوشش کی تھی کہ یہ راز دنیا والوں سے چھپائے رکھتا۔ مگر

آج اس کے قتل کا دن تھا۔ وہ میری محبوبہ تھی، میں نے اس سے محبت کی تھی اور میں نے ہی اسے قتل کیا تھا، میں نے اسے اس طرح گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔

مجمع میں ایک شور، ایک ہنگامہ پیدا ہو گیا، ہر طرف سے ظالم قاتل اور خونی کی آوازیں آ رہی تھیں۔

ایک بولا "لڑکی کے چہرے پر ابھی تک معصومیت برس رہی ہے"۔

"وہ ابھی بلبل کی طرح چہچہا رہی تھی"۔

"اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے"۔

ایک نے کہا "قلندر بڑے دل گردے والا ہے، اس کا یہ فعل ایک شاندار انتقام ہے"۔

ایک بڈھا، جہاں دیدہ بولا، قلندر ہمیشہ قاتل اور خونی ہوتے ہیں۔ یہی ان کی سرنشت ہے!

پیسہ

جب میں نے اس کے ہاتھ سے پیسہ چھین لیا، تو وہ اس طرح نظر آنے لگا جیسے اشرفیوں کا توڑا خالی ہو گیا ہو، آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بھسک بھسک کے بسورنے لگا ——— میں نے جاتے جاتے وہی پیسہ اس کی باہر والی جیب میں ڈال دیا، بسورنے اور بھسکنے میں اُس کو خبر تک نہ ہوئی۔

پچھلے پہر میں اپنے کاروبار سے واپس آیا تو معلوم ہوا وہ سارا دن روتا دھوتا اور ضد پر ضد کرتا رہا ہے۔ لمبی لمبی آنکھیں، سرخ سرخ سے اُبھرے ہوئے گال مجھے ہمیشہ اس طرح نظر آتا جس طرح اکثر جاپانی گیند پر موٹے موٹے خطوں سے شکلیں بنا دی جاتی ہیں، وہ میرا بچہ تھا جو مجھے اکثر پریشان رکھتا تھا۔ پریشانی ہی کا سبب تھا۔ کہ مجھے اتنا بھلا معلوم نہ دیتا تھا۔ جتنا اپنی ماں کو، مگر پھر بھی میرا بچہ تھا

اس کی ہر بات کو ہر ضد کو سراہنا ہی پڑتا تھا۔ اس کی وجہ سے کئی ایسے فرض مجھ پر عائد ہو گئے تھے، جن کو نہ تو میں گوارا کرتا تھا، اور نہ میری طبیعت کے موافق تھے۔ کچھ بھی تھا، پر میں اپنی ان تمام ذمہ داریوں کو محسوس کرتا تھا جن کا سبب میرا بچہ تھا۔

جب سے وہ پیدا ہوا تھا، میری زندگی کے آرام میں جو کمی واقع ہوئی تھی وہ عیاں تھی مگر اس کی ماں کی وہ شکل و صورت نہ رہی تھی، جو پہلے تھی، اس کا سڈول جسم، بڑی بڑی روشن آنکھیں، لذت سے سرشار حرکات، ہرنی کی طرح اِدھر اُدھر پھدکتے پھرنا، کچھ بھی تو نہ رہا تھا۔ تمام کشش اور نزاکت جو اس میں نظر آیا کرتی تھی مفقود ہو چکی تھی اور میں بھول گیا تھا، زندگی اور جینے کا مقصد لاڈ پیار اور محبت سے کچھ الگ بھی ہے سب لذتیں اور لطافتیں کھو جانے کے باوجود، اس کا ضد کرنا، رونا، بغیر کسی مطلب اور مقصد کے چیخ و پکار اٹھانا، ایک اطمینان سا پیدا کر دیتا تھا۔ اور میں سب کچھ بھول کر یہ سمجھ لیتا تھا۔ آخر یہ بھی تو زندگی ہی ہے اور اس زندگی میں بہت سے نشیب و فراز، پوشیدہ ہیں، کبھی کبھی جھنجھلا بھی اٹھتا تھا اور بیوی سے خواہ مخواہ کا جھگڑا مول لے لیتا تھا اور پھر گھنٹوں، ہفتوں اور مہینوں ناراضگی کا بہانہ بنا کر اسے دق کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ منتیں کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ ان سب باتوں کے بعد بھی کوئی چارہ نہ ہوتا کہ اسے گود میں بٹھلا کر پیار کیا جائے اور کہا جائے "میرا لال، میری اُمیدوں کا

سہارا ہے، کس قدر اچھا اور پیارا پیارا ہے۔ انسان فطرت سے مجبور اور عاجز ہے۔
آخر وہی کچھ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جو اس کے آباؤ اجداد نے کیا تھا۔

میں کاروبار سے واپس آیا تو وہ بچوں کے ساتھ کھیل میں محو تھا۔ گھر کے نزدیک بچوں کے کھیلنے کا ایک چھوٹا سا میدان تھا جب تمام بچے مل کر من مانی موج میں کھیلتے تھے تو وہ جگہ انکی ذاتی ملکیت نظر آتی تھی۔ فضا معصوم اور پاکیزہ معلوم ہوتی تھی میں نے اپنے اور دوسرے بچوں کو اس میدان میں کھیلتے دیکھ کر کئی بار اپنی روحانی مسرتوں میں اضافہ کیا تھا وہ ایک پہلو پر کھڑا بچوں کو گیند کھیلتے ہوئے دیکھ کر دل بہلا رہا تھا جب بھی گیند اچھل کر بھولے سے اسکی طرف آن نکلتا تھا تو گیند اچھال کر دور پھینک دیتا تھا پھر تالیاں بجاتا اور خوشی سے نعرے لگاتا تھا بچے اسوقت کتنے پیارے پیارے اور خوش نظر آرہے تھے۔ میں سرکتے سرکتے دبے پاؤں جاکر اسکے پیچھے کھڑا ہو گیا، وہ وہاں سے ذرا ہٹ کر اور آگے ہو گیا اور کھیل دیکھنے میں محو رہا۔ اس کی بھولی بھالی حرکات بہت بھلی معلوم دے رہی تھیں، میں اپنے دن بھر کی تھکن اور الجھنوں کو بھول گیا۔ میں نے شرارت کے ساتھ چھڑی سے اس کی ننھی سی جیب کو چھوا، جس میں صبح اس کو خبر کئے بغیر پیسہ ڈال چل دیا تھا جیب چھو کر میں پھر دُور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا، اس نے فوراً ہی اپنی ننھی جیب کو چھوا اسے غیر ارادی طور پر کوئی چیز، گول گول پیسے کی طرح سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ جیب میں ڈال دیا، اور پیسہ نکال کر ہاتھ پر رکھ لیا۔ پیسہ دیکھ کر احمقوں کی طرح کھلکھلا اٹھا، پھر دوڑ کر اپنے ایک ساتھی کے ساتھ جا کھڑا ہوا، اور ایسا

معلوم ہوا کہ وہ سارے دن کا انتقام اور میری شرارت کا بدلہ اس پیسے سے لینے پر تُل پڑا ہے پھر اس نے تمام میدان کا جائزہ لیا، ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا پھر پیسے کو مٹھی میں زور سے بھینچ لیا، میں نے خیال کیا وہ اب کسی خوانچے والے کی تلاش میں جائیگا۔ لیکن اس کے قدم رُکے رہے اور وہ لبوں پر زبان پھیرتا رہا۔

سامنے کھڑے ہوئے بچے نے اس کا پیسہ دیکھ لیا تھا۔ وہ دونوں تقریباً ہم عمر تھے، مگر دوسرا بچہ صحت اور تندرستی میں اس سے کہیں زیادہ اچھا تھا۔ اس لئے وہ کچھ اس سے خائف اور سہما ہوا نظر آنے لگا، اسے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں اس کا پیسہ چھین نہ لے، میں دُور کھڑا اس منظر کو دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا میری آنکھوں کے سامنے ایک بجلی سی کوند گئی، میرے خیالات کا تسلسل بندھ گیا، میں اپنی زندگی اور مقصد کو بھول کر اپنی جوانی اور عمر کے احساس سے بیکار ہو کر۔ اپنے اندر ایک سرسراہٹ محسوس کرنے لگا۔ اور اس بات کا بھی احساس کرنے لگا کہ میری زندگی اور جوانی میں اس کی خوشیوں کا کس قدر حصہ ہے اور اس جگمگاتی ہوئی جوتی کو کس قدر ابھرنا اور چمکنا ہے۔

میں شدت جذبات اور جوشِ محبت میں سرشار اس کی ہر ایک بات کو دلچسپی سے دیکھ اور سُن رہا تھا۔ چند قدم اور پیچھے ہٹ گیا۔ بچوں کی نرم اور نازک آوازیں میرے کانوں میں گونجیں، انہوں نے باری باری کوشش کی کر

وہ اس سے پیسہ چھین لیں، مگر ان کو کسی قسم کی کامیابی نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی اور وہ میرے دیکھتے دیکھتے پٹنے لگا۔ وہ بلبلا اٹھا اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔ جیسے کسی کو مدد کے لئے پکار رہا ہو۔

وہ میری گود میں پڑا شکایتوں پر شکایتیں کر رہا تھا۔ آنسو پر آنسو بہا رہا تھا وہ صبح سے کہیں زیادہ پیارا اور خوبصورت ——— اس کا بسورنا، اس کا پھسکنا دنیا کی تمام لذتوں اور لطافتوں سے دلکش معلوم دے رہا تھا۔ حتیٰ کہ بیوی اور جوانی سے بھی زیادہ حسین اور خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ اس نے پیسہ مٹھی میں بھینچ رکھا تھا، اور میں انسانی فطرت سے مجبور اور عاجز، اسے سینے سے لگائے اس بات پر غور کر رہا تھا۔ وہ میرے بغیر اور میں اس کے بغیر کیونکر جی سکونگا؟

مزدور

مزدور نے سکّہ لے کر اپنے ہاتھوں کو اس طرح بھینچ لیا جیسے صدف میں قطرۂ نیساں گرے اور وہ پردوں کو سمیٹ لے، مزدور کو مزدوری کیا ملی تھی! ایک خزانہ مل گیا تھا! ——— مزدور مزدوری پا کر کتنا خوش ہوتا ہے، یہ مزدور ہی جانتا ہے، مزدوری اس کی امیدوں سے کہیں زیادہ تھی اور وہ بھی چاندی کا ایک چمکتا ہوا سکّہ! اس نے سکّہ دینے والے کو سر سے پاؤں تک دیکھا، اسے اس میں ایک غیر معمولی بات نظر آئی، مزدور کی ذہنی پہنچ سے دُور اور بُلند!

ہاتھ بند تھا، سکّہ اندر ہی اندر کھنکھنانے لگا۔ اس کی کھنکھناہٹ نے سر بسجود کھڑا کر دیا، وہ مجسم مناجات بنا، انکسار کے اظہار میں لبوں کے اندر

گنگنایا، وہ کیوں گنگنا رہا تھا، یہ مزدور کے شانوں پر لکھا تھا۔ اس کے کھلے ہوئے ہے شانے، تراشے ہوئے بتوں کی مانند ضرورت سے زیادہ پھیلنے گئے۔ بھاری بھاری گردن پر اُبھری ہوئی رگیں، دشوار گذار راستوں کے نشان کی مانند نظر آنے لگیں۔ مزدور کا خون جی بھر کر جوش مارنے لگا۔ کشادہ پیشانی سر کے بال منڈوا رکھے تھے، جن کا اثر اس کی گردن پر بہت زیادہ پڑ رہا تھا، کوئی دیکھے تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ مزدور سمجھتا تھا۔ اس کی مشقت اس کی ریاضت ہے اپنی ریاضت کے نشے میں زور زور سے سانس لیا —— پہاڑ کا پہاڑ، مزدوری کا صلہ پا کر پھولے نہ سمایا —— پسینے کی کمائی مٹھی کھول کر دیکھنے لگا۔ آنکھوں میں احترام لا کر پھر مٹھی بھینچ لی، مزدور کا بیٹا مزدور تھا، خوشی چھپانے کی طاقت اسے عطا نہ کی گئی تھی۔ ذرا سی نوازش سے اس کا دل پسیج گیا تھا۔ وارفتگی میں شہر کی فصیل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا —— جب اپنے سائے پر نظر پڑی تو خوش ہوا، سمجھا، قسمت ناچ رہی ہے، دل چاہتا تھا، کہ زور زور سے ہنسے قہقہے لگائے اور جی بھر کر ادھم مچائے —— قدموں میں آزادی اور بے فکری پائی جاتی تھی، اسے اس پر بڑا مان بھی تھا۔ گھمنڈ سے گردن اُٹھا، بغاوت پر اُتر آیا۔ کہنے لگا۔ اس کے بھی حقوق ہیں، اس کو بھی آرام کی ضرورت ہے —— تھا مزدور کا مزدور، دل کا سادہ، کوئی سمجھنے کی کوشش کرے تو آسانی سے سمجھ جائے، ضدی اپنی ضد سے مفتوح ہو جاتا ہے ایک ادنیٰ سی خوشی نے

دل و دماغ نے بے قابو کر دیا، بے سوچے سمجھے آرام کرنے کا ارادہ کر بیٹھا۔

جو کچھ اسے ملا تھا۔ اس کی مزدوری کا صلہ تھا۔ پر مزدوری کے متعلق اس کا نقطۂ نگاہ بالکل الگ تھا۔ اگر کوئی اس کا چہرہ دیکھ کر اندازہ لگا سکتا، تو اس کے سوا کچھ نظر نہ آتا، کہ اس نے اپنی زندگی کے ہر دن کا آغاز ایک نئی زندگی سے کیا ہے، اس کی ہر صبح شانوں پر مشقت کا بار اٹھائے، مسکراتی ہوئی اس کے پاس آتی ہے اور اس کے قدم چوم کر اسے کہتی ہے، غافل تیرا سرمایہ حیات، بے سر مایہ ہے غفلت نہ کر، کرنے ہی سے کچھ ملے گا —— تمام کائنات کو اس نے مشتبہ نگاہوں سے دیکھا، پنجوں کی گرفت، جو کچھ ڈھیلی پڑ گئی تھی، پھر مضبوط کر لی۔ اور اپنی کائنات کے بل بوتے پر، اپنے قدموں پر اس طرح بے محابا ناچا، کہ گرد و نواح کی فضا نے خوشامد آمیز مسکراہٹ میں داد دی۔

سائے ڈھل گئے تھے، آفتاب پہلے سے سُرخ ہو رہا تھا، فضا سانس لیتی ہوئی جھجکتی تھی، دھوپ ساحل پر سسکتی ہوئی لہروں کی طرح دم توڑ رہی تھی، وہ اپنی دنیا سے دور کچھ اور کا اور بن گیا —— شہر سے بہت دُور نکل آیا تھا۔ جس سڑک پر چل رہا تھا۔ وُہ شہر کی ہاؤ ہو سے دور تھی، وہ ایک جھلسی ہوئے چٹان پر، اپنی تکان کو سمیٹ کر، کچھ دیر سستانے کے لیے بیٹھ گیا —— نیند مختلف شکلوں میں دکھائی دی، چٹان پر پڑا پڑا گہری نیند سو گیا، پہلو بدلا، تو خراٹوں کا سمندر اُمنڈ آیا —— مزدور کی دنیا آہستہ آہستہ محو خواب ہو گئی، دنیا

کا کوئی دکھ اس کے سدِراہ نہ تھا، ایک نیا عالم آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ جیسے اَن دیکھی دنیا دیکھ رہا ہو ششدر سا رہ گیا، نیند میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا، پر پھڑ پھڑانے کی آواز سنائی دی، اپنی کم مائیگی پر سٹ پٹا اٹھا، کہنے لگا، آدمیوں کے پر لگ گئے ہیں، ڈرتا اور سہما ہوا، خود کو بھی اڑتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ اسے نظر آ رہا تھا وہ دھرتی پر نہیں ہے اور حدِ نگاہ تک جو کچھ ہے وہ اس کے بس سے باہر ہے —— اس نے اپنے آپ کو ایسی بلندی پر پایا کہ اگر ذرا سی جنبش بھی ہو، تو گر جائیگا۔ اور جسم پاش پاش ہو کر سوائے خون کے چند دھبوں کے کچھ نہ رہے گا —— نیند کے نشے میں غافل جسم چٹان پر پڑا تھا مگر خوف سے سکڑتا جا رہا تھا۔ نیند کی مستی، تھکان کا بوجھ، اپنے آپ سے بیگانگی اور غفلت سے کسی چیز پر بھی قابو نہ رہا، سب کچھ بھول گیا، بازو ڈھل گئے اور وہ سکہ جس پر بادشاہ معظم کی شبیہ کندہ تھی اور تلوار اور قلم کھدا ہوا تھا مٹھی سے نکل گیا —— محوِ خواب مزدور کے لئے نیند کے سراب نے، منظر کو حقیقت سے بھی زیادہ روشن بنا دیا —— اتنا متاثر تھا، کہ چٹان پر پڑا پڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا، وہ جھلسی ہوئی چٹان پر بے بس پڑا۔ اپنے آپ کو چلتا پھرتا، پاتا تھا، کبھی اڑنے لگتا تھا، اور کبھی اس المناک وادی میں آ گرتا تھا۔ دھماکا ہوتا تھا، تو چیخنے بھی لگ جاتا، بےچینی اور کرب سے کانپتا، ہاتھ پاؤں مارتا، رونے بھی لگ جاتا، پھر منظر بدل جاتا، تو مطمئن بھی ہو جاتا، ذرا سی چمک بھی دکھائی دیتی

تو یہ سمجھتا، سونے چاندی کا دریا بہہ رہا ہے، لوہا لاوے کی مانند پگھل رہا ہے، چٹانیں ہیں، پہاڑ ہیں، اور یہ سلسلہ اتنا وسیع اور دور دراز تک پھیلتا چلا گیا ہے کہ اُس کی وسعت اس دنیا میں کہیں بھی سما نہیں سکتی، اس کی دنیا ہی کتنی تھی جس پر وہ سوچتا، اور کسی ایسے اہم نتیجے پر پہنچ جاتا، جس پر اس کی اپنی ذمہ داری بھی ہوتی۔ اس نے دیکھا دنیا بھر کے مزدور مختلف شکل و صورت والے ایک ہی جگہ جمع ہو رہے ہیں، ان میں کوئی امتیاز اور فرق نہیں، وہ سلوں اور بڑے بڑے پتھروں پر نگاہیں ڈالے، اپنے کندھوں کا بوجھ تول رہے ہیں خواب ہیں اس کے لب ہلتے تھے اور جسم سکڑتا جا رہا تھا ظاہر تھا مزدور رومان بھرے خوابوں کے دیکھنے کا عادی نہیں اس کی دنیا بدل گئی تھی وہ ان اسرار کو جن کا سلسلہ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک لامتناہی صورت اختیار کر گیا تھا سمجھنے کے قابل تھا۔ اس کے چہرے پر کئی قسم کے تغیر پیدا ہو رہے تھے، وہ متاثر بھی ہو رہا تھا اور سمجھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا اس دنیا میں ہاتھ پاؤں مارے اور اس ماحول میں اپنے آپ کو کھو دے تھوڑی دیر کے لئے ان مناظر سے اس قدر مسرور ہوا کہ پہلے کبھی اس نے اتنی مسرت حاصل نہ کی تھی۔ اب اسے آوازیں بھی سنائی دینے لگیں، وہ کان لگائے انہیں سمجھنے کی کوشش کرنے لگا مگر یہ بات کہ وہ کہاں ہے اور کس جگہ ہے اور آوازوں کا مطلب کیا ہے کوشش کرنے پر بھی نہ سمجھ سکا۔ اس نے دیکھا مزدور غول در غول اس دنیا پر چھا گئے ہیں

انہیں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے کی جرأت نہیں ہوتی، یہاں تھڑوں، ھلوں اور سونے چاندی کے بجائے درخت ہیں، خوشنما پھول پتے ہیں۔ زمین سبزہ زار بن رہی ہے۔ سطح ملائم، سبز مخمل نما خوب صورت ہے۔ اس پر بے دردی سے پاؤں رکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ اس کی نگاہ مزدوروں کے پاؤں اور تلووں پر جا پڑی، ان میں بھی وہی ڈاڑیں پڑی تھیں، جو اس کے اپنے پاؤں میں موجود تھیں، مٹی سے اَٹے ہوئے پاؤں، بھاری بھرکم پاؤں، کس کام کے ہیں، اور ان کو یہاں آنے کی اجازت کیونکر حاصل ہوئی —— یہ مزدور نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ رنگ رنگ کے پھول دیکھ کر للچا اٹھا۔ اس نے چاہا کسی پھول کو چھو لے، اور کسی کو توڑ لے، سامنے ایک بڑا زرد سا پھول لہلہا رہا تھا حسرت بھری نگاہ سے دیکھا اور چاہا اسے ٹہنی سے توڑ کر کانوں میں آویزاں کر لے اور دم بھر کیلئے اس چمن کی سیر جی بھر کر کرے —— ذرا تن گیا۔ گردن اوپر کو اٹھا دی اس وقت اسے ایسا ویسا خوبصورت اور بلند مرتبہ بننے کی خواہش پیدا ہوئی جیسا اس نے کبھی کوئی مالک دیکھا تھا اور اس کا وقار اسے من بھایا تھا۔ اور اس نے رشک سے کہا تھا —— یہ دنیا، ان دولت اور وقار والوں ہی کے لئے ہے۔ ہمارا یہاں سوائے چکی پیسنے اور روٹی کمانے کے آخر رکھا ہی کیا ہے؟

مزدور نے دیکھا دور افق پر روشنیاں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہی تھیں، پھول جھک کر ایک دوسرے کو کسی اور ہی سرور سے چوم رہے تھے

ان کے رنگوں میں کتنا ہی امتیاز ہو مگر معلوم دیتا تھا ان میں ایک گہرا تعلق ہے اور اس ہم آہنگی نے ایک توازن پیدا کر رکھا ہے جو اس خاص جگہ کے سوا اور کہیں نہیں ملتا۔ اس جگہ جو کوئی چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ اس کی پیشانی پر تجلی ناچتی تھی اور ان کی خوشی میں بے نیازی دکھائی دیتی تھی، ہر کوئی اپنے اپنے درجے سے پہچانا جاتا تھا۔ سلطان سلطان نظر آتے تھے، اور پیغمبر پیغمبر، کوئی ایک دوسرے کو دیکھ کر سہم نہیں جاتا تھا۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑتی تھی، جو انہیں سجتی تھی، بادشاہوں کے دوش بدوش ان کے مصاحب بھی تھے، رومی، فردوسی اور سعدی بھی تھے —— سب خوش و خرم چل رہے تھے ان کے کندھوں پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ اور نہ ان کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں —— پھر مزدوروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ سب کو سر سے پاؤں تک دیکھا جاتا تھا اور اس بات کا جائزہ لیا جاتا تھا کہ کیا یہ خواہشات جن کے زیر اثر وہ کچھ کا کچھ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ دوسروں میں بھی موجود ہیں، یا وہی اس چمنستان میں اپنی دنیا کے نئے اور انوکھے ہوائی محل تیار کر رہا ہے۔ ایک بہت بڑے درخت کے پاس پہنچ کر رک گیا، یہ درخت ان بڑے پرانے درختوں کی طرح نہ تھا جن کے سائے میں بیٹھ کر اس نے کئی بار دم لیا تھا اور ان کی لٹکتی ہوئی شاخیں افسردگی سے آہیں کھینچتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں، شور بڑھتا چلا جا رہا تھا اور لمحہ یہ لمحہ ایسا نظر آتا تھا۔ کہ ساری دنیا خوش و خرم اور بیدار ہے۔ وہ جاگ رہی ہے۔ اسے جگایا جا رہا ہے

پھر کسی نے شانوں سے پکڑ کر ہلایا اور اشارہ کیا۔ وہ تیرے بھائی بند ہیں تو بھی جا کر ان کے گروہ میں شامل ہو جا اور وہ دنیا جس کے بلند گنبد اور مینار محل اور ایوان آسمان سے باتیں کرتے ہیں، ان کو برباد و تہ و بالا کر دے، وہ دنیا بالکل ہموار بنا دے، تمہیں تمہاری مزدوری کا بہت بڑا صلہ ملے گا ——
یہاں چھوٹی چھوٹی روشنیاں بڑے ستاروں کی مانند نظر آئیں، جو پھیلتی پھیلتی شعلے بن جاتیں، اور پھر جیسے کوئی دم دار ستارہ ہو، جس ستارے پر نگاہ جاتی وہ خوف اور عذاب کے مارے ٹوٹ جاتا، اور ایک قطب سے دوسرے قطب تک پھیل جاتا۔ مثلث اور مکعب شکلیں، اتنی ڈراؤنی ہو جاتی تھیں، کہ ساری دنیا کے مزدور سہم جاتے تھے، وہ کہتے تھے ان کے لئے آج مزدوری بڑی کٹھن ہے، چاہے اس کا صلہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ایک آواز سنائی دی۔ یہ قیامت کا سماں ہے۔ خدا دیکھتا اور سنتا ہے، یہ سب کچھ اس کے حکم سے ہو رہا ہے۔

مزدور اپنے فرائض میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ انہوں نے تہیہ کر لیا، کہ اگر مزدوری کا صلہ بے اندازہ ہی ملنے والا ہے تو اس ملک کا اور اس دنیا کا تخس نخس کر دینگے۔ جو دور کھڑی ابھی تک تکبر سے مسکرا رہی ہے ——
پھر اس نے دیکھا، زمین سے آسمان تک اندھیرا ہی اندھیرا چھا رہا تھا۔ آندھیاں طوفان اُمڈ رہے تھے، ہر مزدور پسینے سے شرابور، اپنے فرائض میں منہمک تھا۔ ان کے چہرے پر استقلال اور قناعت کے نشان تھے، مزدور کتنا جفاکش ہے

جس نے تمام کائنات کو مٹی کا ڈھیر بنا دیا ہے کتنی بیاری ہے مزدوری جس پر اس کی زندگی کا دار و مدار ہے ——— وہ کمر بستہ اور مستعد لوگ اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف تھے، انہیں یہ جاننے کی ضرورت نہ تھی کہ ان کے عمل کا ان کے مالک پر کیا اثر ہوتا ہے۔ ان کے لئے قصر اور جھونپڑا گرانا ایک ہی بات ہے، وہ ایوان اور محل تیار کرتے ہیں، سب کچھ اُن کے پسینے سے بنتا ہے مگر انہیں جرأت نہیں ہوتی کہ وہ کہہ سکیں ان کے حقوق کی تباہی ہوتی ہے۔ ——— شانے سے شانہ بج رہا تھا۔ اور ہر کوئی یہی کہتا سنا جاتا تھا۔ مزدوری تیری برات ہے، یہ تیرے وجود کا ضروری حصّہ ہے، تاکہ تو دل نہ ہار جائے۔

شہر اجڑ اجڑ کر ویران ہو گئے تھے، ایوان اور محل برباد کر دیئے گئے تھے دنیا پھر ہنگاموں میں گھر گئی تھی، ایک شور تھا، ایک چیخ و پکار تھی، مزدور اپنے اپنے فرائض میں مصروف تھے، پیشانیاں چمک رہی تھیں، وہ مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ان کے کان میں قرنا پھونک دی گئی تھی اور ان کے ذمے روز محشر کا اہم کام سپرد کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے ایک ایسی سمت چلنا شروع کیا، جہاں اندھیرے اور کہر کے سبب کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ مزدوروں کے کندھے ایک دوسرے سے بجتے تھے، جبروت کے دباؤ سے مزدوروں کے سر نہ اُٹھتے تھے۔ انہیں علم تھا۔ یہ مزدوری ان کا پیچھا نہ چھوڑے گی، اور وہ سرزمین جس پر ارادتاً "بلائے گئے تھے" ان کی روزانہ زندگی سے کہیں

کٹھن ہے۔ یہ جہاں بھی ان کی جسمانی آزادی سے مبرا تھا۔ وہ قدم قدم چلتے زور سے سانس بھی نہ لے سکتے تھے، اور اتنا بھی نہ کہہ سکتے تھے، آخر ان کے فرائض کی کوئی انتہا بھی ہے یا نہیں۔

مزدور جن کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ ان کے چہروں پر تصنع کا کوئی نشان نہ تھا۔ مایوسی ان کے پاس نہ پھٹکی تھی، وہ ابھی تک اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف تھے، کیونکہ انہوں نے زندگی بھر کبھی کوتاہی نہ کی تھی، کوئی کہے یا نہ کہے، کوئی پوچھے یا نہ پوچھے، وہ ایک ہی بات جانتے تھے، وہ مزدور ہیں، وہ جہاں بھی ہوں انہوں نے مزدوری سے پیٹ بھرنا ہے۔ اور اپنے اعمال سے بنی نوع انسان کی خدمت گزاری کرنی ہے، وہ پشت در پشت سنتے آئے تھے، بہشت نیک اور صاحب نصیب لوگوں کے لئے ہے اس پر جاہلوں کا کوئی حق نہیں، وہاں بدنصیبوں کا کوئی دخل نہیں —— یہ بہشت ہی تو تھی جسے مزدور نے دیکھا تھا۔ اس نے سنا تھا بہشت میں مقدس قصر، بڑے بڑے عالی شان ایوان، اس میں دودھ کی نہریں چلتی ہیں، وہاں لطیف غذائیں اور نعمتیں مہیا ہیں جنہیں کبھی فنا نہیں، اور یہ سب کچھ اللہ کے نیک بندوں کے لئے ہے۔ بہشت کی تمام نعمتیں اور زینت، غلمان اور حوریں انہی کے لئے ہیں، وہ برکتیں، وہ نعمتیں جو خالق نے اپنے بندوں کے لئے بنائی تھیں، مزدور سوچنے کی بھی کوشش کرتا تو حاصل

نہ کر سکتا تھا۔ دنیا کا آرام، عقبیٰ کا آرام ہے۔ اس نے دنیا میں سوائے آوارہ گردی کے کچھ نہ کیا تھا۔ یہ مزدور کو خواب میں بھی نہ بھولا تھا۔

مزدور نے پھر دیکھا جیسے دنیا دو حصّوں میں منقسم ہو گئی ہے شعلے اُٹھنے لگے ہیں۔ چنگاریاں اُڑتی نظر آتیں۔ لاوا بہہ نکلا۔ شدت کی گرمی محسوس ہونے لگی۔ آتشیں طوفان تمام وسعت پر چھا گیا۔ المناک چیخیں فضا میں، خطرناک گونج پیدا ہوئی۔ کسی نے چلا کر کہا۔ "یہ دوزخ ہے۔ گنہگاروں کے لئے عذاب کی جگہ، اس سے انسانوں کو پیغمبروں کے ذریعے ڈرایا گیا تھا اور سمجھایا گیا تھا۔ دوزخ کا عذاب، انسانی برداشت سے باہر اور اٹل ہے۔ دوزخ دوزخ ہے۔ کسی کو کہنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ مزدوروں کے کان بہرے ہو گئے تھے، ان کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں سونے اور چاندی کی سلیں، ہیرے اور جواہرات پگھل رہے تھے، وہ پیپ اور گندھے گاڑھے خون کی مانند بناتے جا رہے تھے، آواز آئی انہیں دوزخیوں کے حلق میں اُتارا جائیگا۔ انہیں شدید عذاب دے کر مارا جائیگا۔ فضا پر آتشیں بادل، خوفناک بجلیوں کی گرج، گرد و غبار، اندوہناک اندھیرا چھا گیا۔ کوئی شکل و صورت اب اسے دکھائی نہ دیتی تھی۔ ماحول بالکل بدل گیا تھا جو اس کی عقل و فہم سے دُور تھا خوف کے مارے پسینہ سے تر ہو گیا، گھبرا کر ہاتھ پاؤں مارنے لگا چیخیں نکل گئیں —— اُٹھ کر بیٹھ گیا، تمام بدن پسینے سے شرابور تھا۔ گرمی محسوس کرنے لگا۔ آنکھ اُٹھا کر ادھر اُدھر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ پھر ایک بار آنکھیں

بند کر کے لیٹ جانے کی کوشش کی گھبرا کر ادھر سے اُدھر پہلو بدلا، وہ چٹان جس پر ساری رات اپنے مستقبل کا حشر دیکھتا رہا تھا۔ ہلتی ہوئی محسوس ہوئی اس دنیا اور اس دنیا کے درمیان جس دنیا کو اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ ایک دڑار سی پڑی ہوئی دکھائی دی جی میں آئی بھاگ جائے، اور مزدوروں میں جا کر مل جائے، جو سڑک کے اس پار، شہر والوں کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ افق پر آفتاب کی روشنی سکوت افزا تھی، آفتاب اُبھرتا آ رہا تھا۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی شعاعوں سے آسمان اس طرح نظر آ رہا تھا جیسے ایک نیلی منقش چادر پر کسی ماہر زر دوز نے سلمہ ستارہ ٹانک دیا ہے ــــــ دور درختوں کے جھنڈ اس طرح نظر آتے تھے، جیسے خوشگوار سائے ہوں، چرند، پرند گھونسلوں سے نکل، سامان زندگی اور روزی کی تلاش میں شہر کی جانب جا چکے تھے، اور جو کچھ باقی تھے، وہ بھی جا رہے تھے، وہ بھی شہر کی طرف اپنے ہی قدموں کے نشان پر لوٹ پڑا، جنہیں رات کی نمی اور گرد و غبار نے مسخ کر دیا تھا۔

بار بار پلٹ کر دیکھتا، اور ہر گھڑی اس منظر کو دیکھنے کی کوشش کرتا، جو اس نے تمام رات بے چینی میں دیکھا تھا۔ پھر دو قدم چلتا تھا۔ اور چونک اُٹھتا تھا، کہ اس بستی کا کوئی باشندہ، تو اس کا پیچھا نہیں کر رہا۔ ملائکہ اسے پکڑنے کے لئے دوڑے تو نہیں آ رہے، وہ ناگ جو دودھ پلا کر دوزخیوں کو ڈسنے کے لئے پالے گئے تھے، کہیں رینگتے تو نہیں آ رہے، مگر خوف اور گھبراہٹ میں

تمام وسوسوں کو جھٹلاتا ہوا، چلتا رہا اور کہتا رہا بچپن سے آج تک ایسے ہی قصے کہانیاں سنتے چلے آئے ہیں، مزدور کو ان کے سچ یا جھوٹ ہونے سے کیا؟

رات کے واقعات نے اسے وہمی بنا دیا تھا۔ مزدوروں میں ملنے کو گھبرایا ہوا چلتا جا رہا تھا۔ اب سڑک پر آگیا تھا۔ اس پکی سڑک پر جس نے شہر کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ سڑک اس طرح نظر آئی، جیسے اس کا سینہ دھک رہا ہو اس کا دل لرز رہا ہو اور وہ اپنی پختگی کے باوجود بھی سستا رہی ہو، وہ دم توڑ رہی تھی گویا اس کو اپنے المناک انجام کا پورا پورا علم ہے۔ بائیں جانب سے جہاں تک اس کی نگاہ کام کر سکتی تھی، ایک جگہ سے بے وجہ گھوم گئی تھی۔ کہتے ہیں یہ قدیم زمانے سے چلی آئی ہے۔ اس کی بابت ایک مبارک پیشنگوئی مشہور ہے، کہ دنیا اسے ابد تک روندتی رہے گی۔ اس بیسویں صدی میں آج بھی اس پیشنگوئی میں فرق نہیں آیا۔ موجودہ حکمرانوں نے اس سے زیادہ خدمت حاصل کرنے کے لئے اس کا سینہ سیاہ کر دیا ہے اور اسے اس کی قسمت پر چھوڑ دیا ہے، جس طرح ندیاں دریا میں آکر مل جاتی ہیں۔ اسی طرح اس سڑک میں بھی کئی سڑکیں آکر ملتی ہیں کوئی نہیں کہہ سکتا۔ اس کو کسی کے خلاف کوئی شکایت بھی ہے، یہ سڑک اور دنیا بھر کی تمام سڑکیں مزدور کے خون کا نچوڑ ہی تو ہیں۔

مزدور رات کے تمام واقعات کو ایک وہم اور لالعینی خواب سمجھتا ہوا چلا جا رہا تھا کبھی سڑک پر خیال دوڑاتا تھا۔ اور کبھی آفتاب کو دیکھنے لگتا تھا۔ اب

سورج کافی بلند ہو گیا تھا۔ ایک تسکین سی پیدا ہو گئی، اپنے آپ کو شہر کا باشندہ سمجھنے لگا۔ یہی جگہ تھی جہاں قدم دیتے دبتے، زندگی کے اچھے بُرے دن گذار رہا تھا۔ چلتا چلتا اکتا گیا، تو خیال کیا غلط سمت جا رہا ہے، اس کا ٹھکانا اور جان پہچان کے لوگ شہر کی دوسری طرف رہتے تھے، اس طرف کو چل دیا، موڑ مڑ جانے کو تھا۔ کہ آواز سنائی دی، آواز میں کرختگی پن تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا کوئی اسے بلا نہیں رہا تھا۔ پھر مطمئن ہو کر سڑک کے درمیان چلنے لگا۔ اس وقت اس کے جسم سے چنگاریاں نکل رہی تھیں، فضا میں قہقہے سنائی دیتے، جیسے انسانوں پر طنز اور تنقید کی جا رہی ہو، پھر اسی لب ولہجہ میں آواز آئی۔ سڑک کے اس پار دیکھا تو ایک ادھیڑ سا سپاہی، دور ایک پلی کے پاس کھڑا کسی رہگذر سے باتیں کر رہا تھا۔ وہی تھا جس نے اسے بلایا تھا۔ وہ اس وقت وردی پہنے ہوئے نہ تھا۔ ایک مکروہ شکل وصورت کا کتا اس کے قدموں میں کھڑا اس کے پاؤں چاٹ رہا تھا۔ سنتری کبھی کبھی پاؤں اُٹھا کر اسے دھتکار بھی دیتا تھا مگر کتّا پھر اس کے پاؤں چاٹنے لگتا اور اتنا منہمک ہو جاتا۔ جیسے کسی نہایت خوش ذائقہ غذا کو چٹخارے لے لے کر کھا رہا ہے۔ سنتری نے کتے کے اس فعل کو دیر تک جاری رہنے دیا۔ اسے ذرا بھی محسوس نہ ہوا کہ کسی قسم کی کراہت پیدا ہو رہی ہے سنتری رہگذر سے باتیں کرتا۔ اس طرح معلوم ہوتا تھا۔ گویا اس نے اسے بے وجہ روک رکھا ہے۔ راہ گذر کے چہرے پر نفرت کے نشان موجود تھے ــــــ سنتری جب

اپنی خشک، سکڑی ہوئی جلد اور مکروہ شکل کے ساتھ مسکراتا تھا، تو اس کے دانت
اس طرح نظر آتے تھے گویا کوئی مکّار لومڑ اپنا چہرہ پانی میں دیکھ کر جھنجلا رہا ہے
بعض اوقات ایسا بھی نظر آتا تھا۔ گویا کتے اور اس میں کوئی نمایاں فرق نہیں رہا
کیونکہ اس کے خارش زدہ کتے کا بدن بھی، اس کی خشک اور سکڑی ہوئی جلد کے
مشابہ ہو گیا تھا۔ وُہ ایڑیاں اٹھا کر، ذرا گھوم کر نیچے کتے کو بھی دیکھ لیتا تھا
مزدور اب ان دونوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ سنتری نے مخاطب کی طرف دیکھتے
ہوئے مزدور کا جائزہ لیا، پھر کتے پر لات اٹھائی۔ کتا ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو
گیا۔ مخاطب بچارا خوشامدانہ فقرے دہرا رہا تھا۔ جن کا مطلب ہمیشہ ایک ہی ہوتا
ہے، اور شریف آدمیوں کے نزدیک ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ان میں
دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ ایسے رذیل سنتریوں سے چھٹکارا پانے کیلئے
مخاطب اور اس کے بھائی بندوں کے پاس کوئی دوسرا گر بھی تو نہیں، مزدور
کھڑا دونوں کی باتیں سن رہا تھا اس نے بھانپ لیا تھا۔ اس کا کیا حشر ہونے
والا ہے، وہ ایسی کئی بگاریں کاٹ چکا تھا۔ پر مطمئن تھا۔ ابھی دن کی ابتدا ہی
ہوئی ہے، تمام دن روزی کے لئے پڑا ہے کچھ نہ کچھ ضرور ہو کر رہیگا ـــــ تمام
دن کی محنت میں ایک لمحہ بگار بھی سہی۔ چپ چاپ حکم کا منتظر کھڑا رہا۔
مزدور کچھ اس لئے بھی بے فکر اور خاموش تھا۔ کہ شاید وُہ سنتری کے مخاطب
کے حصے میں آئیگا۔ اس نے خیال کیا۔ اگر وہ مخاطب کے حصے میں آیا۔ تو اس کی

مزدوری کا صلہ ضرور مل جائیگا۔ لیکن جب سنتری نے کتّے کو پاؤں سے دھتکارتے ہوئے پرے ہٹایا، اور مزدور سے کہا، بڑا پیارا کتّا ہے، اسے خارش نے خواہ مخواہ آن دبوچا ہے۔ بڑا خوب صورت تھا! — پھر نہایت شفقت سے کتّے کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ کہنے لگا اس کا رنگ بھورا بھورا تھا۔ گردن کے گرد بڑے بڑے بال تھے، اور پیشانی بھی خوب چمکیلی تھی، مجھ سے بڑی محبت کرتا ہے۔ میرے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر کسی دوسرے سنتری پر میرا دھوکا کھا بھی جائے تو پاؤں چاٹ کر واپس لوٹ آتا ہے۔ بڑا ہر دلعزیز ہے۔ میں نے اس کی خوراک میں کبھی فرق نہیں آنے دیا۔ ایک دفعہ میرے ساتھ ایک تفتیش پر گیا تھا، تو ہر روز پاؤ بھر مکھن چاٹ جاتا تھا — مزدور نے کتّے کی تھوتھنی پر نگاہ ڈالی۔ خارش زدہ تھوتھنی دیکھ کر اسے سخت نفرت پیدا ہوئی، مگر اتنی ہمت اور جرأت نہ تھی کہ کتّا گود سے اُتار کر زمین پر دے مارتا — مزدور مزدوری سے انکار کر سکتا تھا۔ مگر کتّا گود سے نہیں اُتار سکتا تھا۔ کیونکہ کتّے کا مالک سنتری پاس ہی کھڑا تھا۔ مزدور نے اپنے حقوق کی پائمالی کر کے، سنتری کے حقوق کو تسلیم کر لیا تھا۔ کیونکہ مزدوروں سے بیگار لینا سنتریوں کا دائمی حق ہے۔ مزدور نے اس سے پہلے بھی ایسی کئی خدمات انجام دی تھیں، جن کا صلہ سوائے لات اور گالیوں کے کچھ نہ ملا تھا — سنتری نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، کتّا تو ہمیشہ وفادار رہتا ہے، مگر اس میں وفاداری کی خاص خصوصیات

ہیں یہ بہت بڑھیا نسل کا ہے، اس کی ماں انگریزی نسل کی تھی اور باپ روسی نسل کا، وہ جوڑا ہمارے ایک اعلےٰ افسر کے پاس تھا۔ وہ افسر اب ریٹائر ہو کر فرانس میں آباد ہوا ہے۔ یہ جوڑا حاصل کرنے میں اس کی ساری کمائی خرچ ہو گئی تھی۔ صاحب مجھ پر بہت مہربان تھا چوبیس گھنٹے اس کی اردل میں رہتا تھا۔ صاحب کہتا تھا۔ ول تم بہت وفادار ہے، ہمارے کتوں سے بھی زیادہ ——— صاحب بڑے بڑے انسپکٹروں کی باتوں پر بھی کان نہیں دھرتا تھا۔ بڑا سخت تھا، کسی کی بات نہیں مانتا تھا۔ برابر دو سال اس کے ساتھ کیمپ میں رہا ہوں۔ صاحب کہتا تھا۔ یہ نسل ہندوستان میں کسی کے پاس نہ رہنے دونگا۔ مگر مجھ پر بڑا مہربان تھا اپنی نسل کا واحد ہے یہ کتّا، تمام ہندوستان میں ایک ہی تو ہے ——— جب سے یہاں بدل کر آیا ہوں، اسے خارش ہو گئی ہے۔ تھانہ کے اندر اور باہر غلیظ کتوں کا جمگھٹ لگا رہتا ہے۔ یہ سب ان گھٹیا قسم کے کتّوں سے میل جول کا نتیجہ ہے یہ بازاری کتّے سخت غلیظ ہوتے ہیں۔ یہ میری غیر حاضری میں اِدھر اُدھر گیا ہو گا انہیں چھونے سے خارش ہو گئی ہے اصل چھوت کی بیماری خارش ہی تو ہے، کس قدر حلیہ خراب ہو گیا ہے غریب کا۔ سنتری نے پھر کتّے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مزدور کے دل میں سخت نفرت پیدا ہوئی ——— سنتری بولا ہسپتال سے لے کر آ رہا ہوں، وہاں کئی ڈاکٹروں نے اسے دیکھا ہے مگر وہ بڑا صاحب بڑا سمجھ دار ڈاکٹر ہے۔ کہتا تھا۔ جہاں کا

میں رہنے والا ہوں، وہاں کے کتّے بھی بڑے مشہور ہوتے ہیں، ایک دفعہ ایک ہندوستانی مہاراجہ لاکھوں روپے کے خرید کر لایا تھا اور جب کوئی بیمار پڑ جاتا تھا تو مجھے ہی جانا پڑتا تھا، وہ کتوں کے علاج میں بڑا ماہر ہے۔ اس نے تو دیکھ کر ہی کہہ دیا تھا۔ "بڑھیا نسل کا کتّا ہے" اس کا علاج مجھے خود ہی کرنا پڑیگا۔

یہ دیسی ڈاکٹر گائے بھینسوں کے لئے اچھے رہتے ہیں۔ سنتری راہ گذر سے مخاطب ہو کر بولا۔ مگر تم جانو چھوٹے ڈاکٹر چھوٹے ہی ہوتے ہیں۔ ان کی سمجھ بھی چھوٹی ہوتی ہے۔ کہتا تھا معمولی نسل کا کتا ہے۔ اس کی خارش ناقابل علاج ہے اس کو تو گولی مار دینی چاہئے —— "بڑا آیا گولی مار دینے والا!"

سنتری آگے آگے اور مزدور پیچھے پیچھے کتّا اٹھائے جا رہا تھا۔ غریب اپنے نصیب پر لعن طعن کرتے کرتے پسینہ پسینہ ہو گیا، اس وقت اسے رات کے دلفریب واقعات یاد آئے، دل پکڑ کر رہ گیا۔ زندگی روکھی اور اداس نظر آنے لگی۔ اس نے سوچا یہ اس کی کم مائیگی کا سبب ہے، یا دنیا ہی بدل گئی ہے اس نے سنتری سے لے کر، انسپکٹر تک اور انسپکٹر سے لے کر بڑے افسر تک کو دیکھا۔ ایک ایک کر کے سب اس کی نگاہوں کے سامنے آئے، طنز سے مسکرا دیا، کیسے شان دار لوگوں کی مزدوری اسے کرنی پڑی تھی اور کس کس سے اس کا واسطہ پڑا تھا —— مزدور ذلیل تھے، اسے یہ محسوس کر کے، سخت صدمہ ہوا مگر کندھے ابھی جواب نہ دے چکے تھے، جوان اور تندرست تھا۔ اس کا

خون کھولنے لگا۔ کئی مختلف خیالات آئے مگر کتّے اور سنتری کو دیکھ کر چپ کا چپ رہ گیا اور چلنے سے نہ رُکا، اور نہ اس کی چال میں فرق آیا، مزدور کی اوقات مزدوری کرنا ہی تو ہے۔ اس کی یہی زندگی ہے اس نے اسی طرح جینا ہے۔

ابھی رات کا بوجھ اُترا نہ تھا۔ چلتے چلتے کچھ پیچھے رہ گیا۔ اسے یقین تھا۔ اس مزدوری کا صلہ اسے ایک نقلی سکہ بھی تو ملنے والا نہیں، رفتار سُست پڑ گئی تھی۔ سنتری نے دیکھا، تو مغلظ گالیاں دیں، ایسوں کو اس کے بلانے کا یہی ڈھب تھا —— چلو چلو جلدی چلو، مجھے تھانہ میں وقت پر پہنچنا ہے، دوسرے سنتری کو ڈیوٹی سے الگ کرانا ہے —— بچارا، مزدور دوڑ کر سپاہی کے قریب ہو گیا۔ سنتری نے گھور کر دیکھا اور کہا، کندھا ملا کر چلتا ہے —— اس وقت اس کے غم اور غصے کی انتہا نہ رہی، پر سنتری کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ پسینہ پسینہ ہو گیا، یہ خیال بھی نہ لایا۔ کہ رات کن لوگوں کے ساتھ شانے سے شانہ ملائے چلتا رہا تھا، کتے کو دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کی نظروں میں کتے کی بہت عزت تھی۔ بازوؤں کو سکیڑ لیا، گویا، اسے پیار کرنے لگا ہو، اس نے خیال کیا، اس کی حالت کتے سے بھی بدتر ہے!

اسے نہایت صدمہ ہوا۔ اس نے کہا ہمیں کتے جتنا بھی صلہ نہیں ملتا۔ گرنت ڈھیلی پڑ گئی۔ آبدیدہ سا ہو گیا۔ بہشت اور دوزخ دیکھ چکا تھا۔ سوچتا تھا مزدور کا بیٹا مزدور ہی تو ہے، اس کی دنیا تنگ اور تاریک ہے۔ اس دنیا میں اور

اس دنیا میں جینے کا حق انہی کا ہے، جو اچھے اعمال، اچھے نصیب لائے ہیں جب تھانے کے سامنے آکر کھڑا ہوا، تو سنتری کو ایک دوسرے سنتری نے سلام کیا اور کتے کو دیکھتے ہوئے مذاق کے لہجے میں کہا۔ "اس کو گولی مروا دو تو اچھا ہے، اب اس پر وہ پہلے والی بات آنے کی نہیں" —— کتے والا سنتری بولا۔ "بڑا خوش قسمت ہوں، ابھی ابھی ہسپتال سے آرہا ہوں، بڑے ڈاکٹر نے خود کتے کا معائنہ کیا ہے اور خود ہی دوائی تجویز کی ہے —— کتا مزدور کے ہاتھ سے لے کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے زمین پر چھوڑ دیا اور کہا۔ چند دن بعد دیکھنا، کس قدر بہار آتی ہے اس پر —— مزدور نے کتا چھوڑ کر ابھی سنتری کے چہرے پر نگاہ ڈالی ہی تھی کہ اندر سے ایک انسپکٹر نے مزدور کو تھانے کے احاطے میں کھڑے دیکھ کر پکارا، اسے جانا نہیں —— ذرا تانگوں کے اڈے تک تو پہنچا دے۔ مجھے اسٹیشن جانا ہے۔ مزدور کی حالت سخت زار تھی، تھانہ کی چار دیواری دیکھنے کی بجائے، کتے کی طرف دیکھنے لگا۔ جو آہستہ آہستہ سنتری کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔

اسے فرصت بھی نہ ملی تھی، کہ رات کے خواب کے متعلق مزدوروں کو کچھ جا سناتا اور بتاتا کہ اس نے بیتی ہوئی رات کس طرح گزاری ہے، تھانہ کی چار دیواری میں مطمئن طور پر کھڑا اِدھر اُدھر نگاہیں ڈال رہا تھا۔ نہایت ضبط سے کام لے رہا تھا تاکہ تھانے کا ماحول اسے اور زیادہ دکھ نہ پہنچا سکے، ایکا ایکی اس کی نظر سامنے حوالات کی سلاخوں پر جا پڑی، ایک بوڑھا سفید ریش سلاخوں کو پکڑے باہر کی طرف غمگین

اور اداس دیکھ رہا تھا۔ بوڑھے کو دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوا۔ قریب تھا کہ اس کی چیخیں نکل جائیں، کیونکہ گزشتہ رات، بالکل ایسا ہی مقدس چہرہ بہشت میں بڑا خوش و خرم دیکھ چکا تھا۔ ملائکہ اس کے ساتھ آنکھ ملاتے ہوئے بھی ڈرتے تھے، بہشت والے کہتے تھے، اس کی طفیل ہزاروں گنہگار جنت میں داخل ہوئے ہیں، وہ کمزور اور گنہگار انسانوں کے لئے ایک رحمت ہے —— اس کا سر چکرانے لگا۔ اس کی نظریں نہایت مبہم طور پر گھومتی رہیں، اس نے محسوس کیا، وہ اندھیرے کی اتھاہ گہرائیوں میں جھانک رہا ہے، گویا کچھ کھو گیا ہے، جس کی اسے تلاش ہے۔ اس نے بوڑھے کے چہرے کو نہایت عقل و فکر سے دیکھا، اس نے کئی ایک نشان ڈھونڈنے چاہے، پیشانی پر نگاہیں گاڑھ دیں۔ اس کا دل چاہا۔ کہ وہ اس سے پوچھے۔ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ کیا اس نے جنت دیکھی ہے —— انسپکٹر نے کڑک کر آواز دی، تمام ماحول بدل گیا۔ جیپ کا چپ اس ٹرنک اور اسباب کی طرف دیکھنے لگا جو اس نے اپنے کندھوں پر اٹھانا تھا۔ "بستر بھی ٹرنک پر رکھ لو"

اس نے ویسا ہی کیا جب چلنے لگا، تو انسپکٹر نے کہا۔ یہ میری چھتری، لوٹا اور گلاس بھی پکڑ لو۔ سفر میں ان کی بہت ضرورت پڑتی ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک انسان نہیں، اسباب کا ڈھیر نظر آتا تھا!

انسپکٹر چلنے ہی کو تھا۔ کہ ایک اور انسپکٹر اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا معاملہ بہت اہم ہے، ابھی ابھی فون پر حکم آیا ہے۔ کہ مزدوروں نے پھر

پھر انقلاب بپا کرنے کی تحریک شروع کر دی ہے، اس تحریک کو دبانا نہایت ضروری ہے، دونوں کھڑے کھڑے نہایت رازدارانہ انداز میں باتیں کرنے لگے —— باتیں بہت دیر تک جاری رہیں، مزدور اسباب اٹھائے تھانے میں کھڑا تھا۔ پہلی دفعہ تھانے میں آیا تھا۔ یوں تو اس نے ایسے کئی دھندے کاٹے تھے، مگر ایسا اہم کام کبھی انجام نہیں دیا تھا۔ اسباب اٹھا کر بے حس و حرکت حکم کا منتظر کھڑا تھا۔ وہ یہ بھی تو نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ اس کے بس کا کام نہیں، اسے کیا ملنا چاہئے، اس کا کیا حق ہے، وہ کوئی حق رکھتا بھی ہے یا نہیں چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ طاقت جواب دے رہی تھی —— مگر اف تک نہیں کر سکتا تھا۔

دوسرا انسپکٹر سیاہ رنگ کا اور چیچک رو تھا سیاہ کالی جلد پر کالے کالے داغ عجیب معلوم دے رہے تھے۔ دیکھ کر گھن آتی تھی، دونوں انسپکٹروں کی گفتگو طول پکڑ گئی تھی۔ اسٹیشن جانے والے نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ اب وہ گاڑی پر سوار نہ ہو سکے گا۔ اسٹیشن پر اسے دوسری گاڑی کا انتظار کرنا پڑیگا اس وقت دوسرے انسپکٹر نے اطمینان ظاہر کیا، اور کہا اتنے وقت میں وہ ضرور کسی مفید نتیجے پر پہنچ جائیں گے، مزدور بچارا اسباب اٹھائے ڈھیر کا ڈھیر بنا کھڑا تھا یہ سن کر سٹ پٹا اٹھا۔ مگر زبان سے کچھ بھی نہ کہہ سکا، اس نے دور سے کھانسا جیسے اسٹیشن پر انجن نے چیخ ماری ہو —— انسپکٹر نے پھر گھڑی دیکھی اور دو سنتریوں کو ساتھ لے کر تھانے سے باہر نکل گیا، وہ آگے آگے سنتری پیچھے سے مختلف مقدمات

کے بنانے اور ان کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے گفتگو کرتا جا رہا تھا۔ مزدور آہستہ آہستہ ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس دفعہ انسپکٹر نے پیچھے مڑ کر مزدور کو اسی طرح دیکھا جیسے وہ بھی باغی مزدوروں میں سے ایک ہے!

سڑک پر آنے جانے والوں کا ہجوم زیادہ تھا۔ کوئی بھی نہ دیکھتا تھا کہ مزدور انسپکٹر کا سامان اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے وفادار کتے کی طرح چلا جا رہا ہے انسپکٹر کو صرف اتنی ضرورت تھی، کہ وہ تانگہ پر سوار ہو جائے اور وقت کے اندر اندر اسٹیشن پر پہنچ جائے کیونکہ اسے ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں آج ہی پہنچنا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب، مکان میناروں کی طرح بلند ہوتے گئے تھے۔ جن سے مزدور کو اپنے پسینے کی بو آتی تھی۔ وہ ان کی مزدوری حاصل کر چکا تھا۔ اس کی مزدوری نے ایسی خوب صورت شکل اختیار کر لی تھی کہ اب ان پر مزدور کی مشقت کا کوئی گمان نہ ہوتا تھا، گردن بوجھ سے دبی ہوئی تھی۔ صبح سے ایک ہی دھندے یعنی بیگار میں پھنسا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس نے لوگوں کے چہرے پر اداسی سی دیکھی، جو اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی، اسے ہر کوئی بوجھ سے دبا ہوا نظر آیا، جو بھی ہے، وہ اپنے اپنے عذاب اور گناہوں سے دبا ہوا، کفارہ ادا کر رہا ہے، دنیا دکھ سہتی ہے، دکھ نے سب کو لذت آشنا بنا دیا ہے۔

مزدور کا دل بار بار دکھ اور کرب سے بھیج جاتا تھا مگر سخت گیر واقع ہوا تھا انسانیت کی توہین سمجھ کر، اپنے فرائض میں ہرگز کوتاہی کرنی نہیں چاہتا تھا —

چاہے وہ آزادی کا منہ دیکھے، پر اسے کھانے کو ملنا چاہیے، اس کا بھی جینا ہی تھا اسکے بھی ماں باپ تھے لیکن یہ سوال اس کی آنکھوں میں کہاں تھا۔ اس کی تلاش مشکل تھی۔ اس کی آنکھوں میں یہ بھی تو تھا۔ کہ وہ آسائش کا متلاشی ہے، وہ دوسروں کو نفرت سے دیکھتا ہے، اس کی بھی کوئی پسند ہے، اپنے بدن کی آسائش اور راحت میں اس کا بھی حصہ ہے۔

جب بڑے بازار میں آگیا، تو ذرا اطمینان سے سانس لیا، سمجھا اب وہ تانگوں کے اڈے پر جلد پہنچ جائیگا، اور اسباب چھوڑ کر بھاگ نکلے گا۔ وہ سارا دن اِدھر اُدھر پھرتا رہے گا۔ سوچتا تھا۔ وہ مزدور سہی، اس کا صلہ مزدوری سہی، پر وہ کچھ اور بھی تو کر سکتا ہے۔ شہر کا یہ حصہ اپنی خصوصیات کی وجہ سے بڑا پُر رونق اور ہر دل عزیز تھا۔ صفائی کے پورے پورے انتظام تھے، بہترین لوگ اس بازار میں آنے جاتے تھے، یہاں کبھی مزدور آتے بھی تھے تو مزدوری کیلئے آتے تھے اور اگر کوئی آوارہ پھرتا پھرتا ادھر آ بھی نکلتا تھا تو اس پر پولیس شک کرنے لگتی تھی — انسپکٹر کے پیچھے پیچھے بھیک سمت چلا جا رہا تھا لیکن پھر بھی انسپکٹر اسے مُڑ کر دیکھ لیتا تھا۔ یہ فٹ پاتھ جس پر چل رہا تھا پتھر کی بڑی بڑی سلوں سے تیار کیا گیا تھا۔ یہ سلیں اتنی گندی اور ناکارہ تھیں کہ مدتوں سے ان کی طرف توجہ نہیں دی گئی تھی۔ انسپکٹر پولیس بڑی تمکنت سے ایڑیوں کے بل فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ اس نے خاکی رنگ کی وردی پہن رکھی تھی۔ یہ ایک ایسا رنگ تھا اگر کوئی دوسرا پہن لے تو اس پر شک سے لوگوں کی نگاہیں اٹھنے لگتی ہیں۔ انسپکٹر چاہے یا نہ چاہے، کچھ

بات ہی ایسی ہے، کہ لوگ اسے پہچان لیتے ہیں، اور انگلیاں اُٹھاتے ہیں۔ کہ وہ جارہا ہے کئی بار ایسا بھی ہوا۔ کہ لوگ اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچے، اور کئی ایسے بھی گذرے جو اسے قدم قدم پر سلام کرتے اور پاس سے سہمے ہوئے گزر جاتے وہ منہ سے کسی کے سلام کا جواب دے یا نہ دے، اس کی مرضی پر منحصر تھا۔ مگر وہ بالشت بھر کی سیاہ چھڑی ضرور ایک بار اٹھا دیتا تھا۔

فٹ پاتھ سے ذرا ہٹ کر چند نوخیز، نو تعلیم یافتہ لڑکیاں آپس میں چہ میگوئیاں کر رہی تھیں، کبھی کبھی کسی راہگذر پر پھبتیاں بھی کستی تھیں اور کبھی اس ہیا کی سے ہنس بھی دیتی تھیں، کہ کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی کہ ان پر کھلم کھلا نکتہ چینی کرے —— ان کی نگاہیں انسپکٹر پر جا اٹکیں، انہوں نے طنزاً کچھ فقرے چست کئے، مگر انسپکٹر بڑا ہوشیار تھا۔ وہ ایسے موقع پر سب کچھ سُن کر بھی بہرہ ہو جاتا تھا۔ اسے ان باتوں کا بہت تلخ تجربہ تھا —— لڑکیاں بے فکر، بے حجاب کھڑی تھیں۔ انہیں بھی ایسے موقعے کم ہاتھ آتے ہیں انہوں نے دبی زبان کے ساتھ مزدور سے کہا "اسباب دے مارو اور بھاگ نکلو" —— ان میں ایک زرد ساڑھی والی بھی تھی، وہ پیچھے ہٹ کر کھڑی تھی۔ جب وہ ذرا پیچھے سرک جاتی تھی، تو ساتھ والیاں اسے پھر بازوؤں سے پکڑ کر ساتھ کھڑا کر لیتی تھیں اس کے دیکھنے اور کھڑے ہونے سے یوں معلوم دیتا تھا۔ جیسے اس نے آج ہی ساڑھی پہنی ہے اور بازار میں بھی آج ہی آئی ہے۔ اور وہ جس نے

سُرخ رنگ کی ساڑھی اور سنہری پوڈر والا پلو، سر سے نیچے گرا رکھا تھا۔ بڑی شائستہ اور سلجھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کی شکل و صورت پر بھی ایک وقار تھا۔ ذہانت اس کے بشرے سے ٹپکتی تھی ——— مزدور کی آنکھوں میں زندگی آگئی ——— عورتوں میں زندگی تھی اور زندگی کا احساس بھی تھا ——— یہاں سے انسپکٹر آنکھیں بچا کر نکل گیا۔ اسے ذرا بھی جرأت نہ ہوئی۔ کہ وہ مزدور کو کہے کہ وہ جلد جلد اس کے ساتھ آملے ——— بازار کی رونق انہی حالات سے دوگنی ہو جاتی ہے اور بازار میں سے گزرنا، کسی طرح سے بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا۔

دھوپ بازار کے وسط میں آچکی تھی۔ کوچ بانوں نے انسپکٹر کو دور سے دیکھ کر، سانس سادھ لی تھی۔ "وہ آتا ہے۔ وہ آتا ہے" یہ سب کی آنکھوں سے ادا ہو رہا تھا، کوئی چلا رہا تھا، تانگے والا خالی تانگہ لے کر بھاگ گیا اور کوئی جانے کی سوچ رہا تھا، کسی نے پاگلوں کی طرح منہ کھول دیا اور بیاد آنے والی سواری دو آنے کو لے کر چل دیا ——— اڈے میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ مگر انسپکٹر سب سے باخبر تھا۔ اسے علم تھا۔ اس نے کیا کرنا ہے۔ مزدور جس کا بدن چور چور ہو رہا تھا، شانے جواب دے چکے تھے، اس کا سر چکرا رہا تھا اس نے اس طرح محسوس کیا جیسے کسی نے شکنجے میں دے کر باہر نکال پھینکا ہے اور وہ کسی بڑے جرم کی سزا میں گرفتار ہو چکا ہے۔ اس کی زبردست خواہش تھی، وہ اپنے آپ کو اس مصیبت سے نکالے اور کسی ایسی جگہ جا پہنچے، جہاں دنیا اس کے کیئے پر نگاہ نہ ڈال سکے۔

انسپکٹر نے ایک جلتے ہوئے تانگے کو روک لیا۔ اس پر پہلے ہی چار سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں، انسپکٹر ناچار پانچویں سواری بن کر، کوچبان کے پہلو میں جا بیٹھا، ایک سواری بڑبڑاتی ہوئی اتر گئی۔ کوچبان بچارا پریشان سا ہو گیا۔ لیکن انسپکٹر پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، اور اس نے مزدور سے اپنا اسباب پورا کر کے رکھوا لیا ——— وہ بغیر مزدوری حاصل کئے کھڑا تھا۔ تانگہ اسٹیشن کو جا رہا تھا۔ جہاں سے ریل مختلف سمت کو جاتی ہے۔ یہ تانگے تمام دن شہر کی مختلف سمتوں سے سواریاں اکٹھی کر کے لاتے ہیں۔ ریل انہی مختلف شہروں میں، مختلف سمتوں میں پہنچا دیتی ہے۔ ریل بھی تو مزدوروں کے بل بوتے پر چلتی ہے۔ دنیا کے سب کاروبار مزدور ہی تو انجام دیتے ہیں جنت اور دوزخ میں بھی تو مزدور کام کر رہے تھے، وہ محلات بنانے اور سونے چاندی کی سلیں پگھلانے کا کام انجام دے رہے تھے!

مزدور بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ کھٹ سے ایک تانگہ اس کے پاس آ کر رکا۔ سواری نے مزدور کو بیکار کھڑے دیکھ کر آواز دی، اسباب اٹھائیگا

ارے مزدوری کریگا"۔ رات کا بھوکا تھا دن بھر کچھ کھانے کو نصیب نہ ہوا تھا سوچتا تھا۔ کس بدبخت کا منہ دیکھا ہے ——— دم لئے بغیر پھر اسباب اٹھانے پر مجبور ہو گیا، گردن جھکا کر، کمر دوہری کر کے، چار و ناچار بوجھ سر پر رکھ لیا اور سڑک کے کنارے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اسی طرح جس طرح انسپکٹر کے پیچھے چلتا رہا تھا، پیچھے پیچھے چلنے سے خیال آیا، کاش خارش زدہ کتا ہوتا تو

اچھا ہوتا ـــــ مالک نے مڑ کر آواز دی، "ذرا جلدی جلدی قدم اٹھاؤ، مزدوری ہمت کرنے ہی سے ملے گی" ـــــ سنتری، انسپکٹر، تھانہ اور پھر خارش زدہ کتا۔ بھیانک شکلیں، آنکھوں کے سامنے بنتی اور بگڑتی تھیں، یہ بھی محسوس نہ کر سکا۔ کہ سر بوجھ سے بھاری بھاری ہے، مالک نے پھر ذرا خلوص سے کہا، "جلدی کرو پیسے زیادہ ملیں گے"۔

اس وقت پھر جنت اور جنت کے رہنے والے نیک لوگ، جن کی پیشانیاں نور سے چمک رہی تھیں، یاد آ رہے تھے، مسافر کے خلوص سے خیال کرنے لگا۔ شاید یہ مسافر بھی اسی جگہ سے آیا ہے۔ اس کی زبان میں بھی مٹھاس ہے، وہ مڑ مڑ کر اس لیئے تو دیکھ رہا ہے۔ جب ذرا قریب ہو جاتا تھا تو اس کی پیشانی پر نگاہیں گاڑھ دیتا تھا۔ مالک نے پوچھا، ماتھے پر لکھا ہوا پڑھ لیتے ہو؟ مزدور مسکرایا، اس وقت ایک غیر معمولی طنز اس کی مسکراہٹ میں پوشیدہ تھی، کہ مالک کانپ اٹھا۔ اس نے کوشش کی، کہ وہ دوبارہ اس سے آنکھ نہ ملائے ـــــ مزدور کے لئے دو پیسے زیادہ کا وعدہ اور پھر ذرا خلوص اور للچاتی ہوئی آواز میں جلدی چلنے کے لئے کہنا، ایک جنت بخش دینے سے کہیں زیادہ تھا ـــــ مزدور کی نگاہ پھل والے کی دکان پر جا پڑی، رات جنت میں بھی پھل پھول دیکھے تھے، سب باری باری یاد آنے لگے۔

دو پیسے زیادہ ملیں گے تو پھل ہی کھاؤں گا۔ آج جی بھر کر پھروں گا۔ میرا

کوئی کیا کر سکتا ہے، اپنی مرضی کا، اپنی خواہش کا مالک ہوں۔"
ایک ہوٹل سامنے آ گیا، وہاں کھانوں کی خوشبو پھیل رہی تھی، زبان نکال کر لبوں پر پھیرنے لگا۔ اور بہت مسرور ہوا۔ کہنے لگا۔ اسباب چھوڑ کر یہیں آئیگا جی بھر کر، جو من بھائے گا، ـــــ ہاتھ منہ دھو کر، کرسی پر ذرا ٹھاٹھ سے بیٹھ جاؤنگا اور آواز دونگا۔ لاؤ جو بہتر سے بہتر تمہارے ہاں موجود ہے ـــــ اشتہا بڑھتی جاتی تھی لیکن مزدوری میں پھنسا ہوا تھا۔ پھر خیال کرنے لگا۔ یہاں مزدور بھی آتے ہونگے۔ آتے کیوں نہ ہونگے، وہ ضرور آتے ہونگے، فرض کر لیا جائے وہ نہیں آتے، تو کیا میں نہ آسکونگا ہ ـــــ یہاں آنے کا سب کو حق ہے۔ جو دام خرچ کریگا۔ ہوٹل اس کا بن جائیگا ـــــ مالک اسباب ایک جگہ پہنچ کر رک گیا، اسباب اُتارا گیا، مزدوری مل گئی ـــــ دیکھا تو دو پیسے کم تھے، سب خوشی کافور ہو گئی، پھل، ہوٹل کا کھانا کچھ بھی یاد نہ رہا، خیال کیا، کچھ بھی نہیں ملا تمام دن مارا مارا پھرتا رہا، سوچتا رہا، دو پیسے کی کمی پوری کرنی ضروری ہے پھر کھانا کھانا بھی تو ضروری ہے۔ مزدور کھانا کھائے گا تو اطمینان کا سانس بھی لیگا مزدوری لے کر ایک طرف کو چل دیا، گردن جھک گئی تھی۔ کمر خمیدہ سی ہو گئی تھی۔ مایوس اور پریشان، خیالوں میں جو نقش بھی دماغ پر اُبھرتا تھا۔ پیسے سے ملتا جلتا تھا۔ اپنے آپ پر شبہ کرنے لگا۔ وہ مزدور نہیں، ڈاکو ہے۔ راہزن ہے۔ اسی جوشِ خروش میں خیال آیا۔ اسے کھانے کے لئے کچھ ملنا چاہیئے۔ ایک روٹی والے کی

کی دکان سامنے آئی۔ ویسی ہی جہاں اس نے دھوئیں میں بیٹھے بیٹھے کھانا کھاتے ہوئے زندگی گزار دی تھی ——— بے دھڑک اندر داخل ہوا، چیتھڑوں بھری باسکٹ کو سنبھالا، اور ہاتھ میں پیسے لے کر گننے لگا۔ اب پیسے گنے تو ایک آنہ زیادہ تھا۔ اچھل پڑا، کوشش کرنے لگا۔ اٹھ کر باہر نکل جائے اور کسی ہوٹل میں جا بیٹھے۔ اور بڑے مزے سے چٹخارے لے لے کر کھانا کھائے، مگر جرأت نہ ہوئی، پاؤں کے بل بیٹھا کھانا کھانے لگ گیا ——— ایک آنے کے متعلق بہت کچھ سوچ رہا جیسے قاروں کا خزانہ ہاتھ آ گیا ہو۔ مالک دکان اس کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ سمجھتا تھا، ایسی شکل و صورت کے کئی مزدور اس کے ہاں آتے جاتے ہیں اس نے اس کی گھبراہٹ پر دھیان نہ دیا۔ پر اس نے یہ ضرور جان لیا تھا کہ مزدور مزدوری سے فارغ ہو کر بے وقت کھانا کھانے چلا آیا ہے۔ اس نے آج جی بھر کر مزدوری کی ہوگی۔ امید سے زیادہ اجرت ملی ہوگی۔ دکان دار مزدوروں کی ذہنیت سے بخوبی واقف تھا۔ دکان کے پچھلے حصہ میں ایک پردہ لٹک رہا تھا۔ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ کہ وہ اصل میں کس رنگ کا تھا۔ اس میں کئی سوراخ اور پیوند لگے ہوئے تھے، پیوند ذرا ابھرے تھے، وہ اپنے اپنے وقت پر لگائے گئے تھے۔ پردہ کی پچھلی طرف دکاندار کا گھر تھا۔ اس طریقے سے اس نے دکان کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا ——— دکاندار کی زندگی مزدوروں کو کھانا کھلاتے کھلاتے گزری تھی۔ وہ کہتا تھا۔ مزدوروں کے دم کے لئے ہی جینا ہے۔

کھاتا کھا کر مزدور "سکے" گنتے گنتے یکایک اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس وقت سخت کرب اور بے چینی سے تڑپ اٹھا کوئی اس کی گھبراہٹ کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کا رواں رواں لرز رہا تھا در اصل اسے اپنا چاندی کا سکہ یاد آ گیا تھا۔ جو اس نے کل کمایا تھا۔ وہ ایک ہی جست میں سڑک کے اس پار پہنچ گیا ——————

پھٹی پھٹی آنکھوں والا گھبرایا ہوا، اپنی کمزوریوں کو نہ سمجھنے والا مزدور پھر ایک بار دام فریب میں گھرا ہوا شہر کی فصیل کے ساتھ ساتھ چلتا جا رہا تھا —— چٹان جہاں اس نے رات بھر گذاری تھی، اُڑتی ہوئی بھاگتی ہوئی ابھی بہت دُور تھی، چاندی کا سکہ، رات کی پریشانیاں، جنت، دوزخ کے نظارے، سنتری اور انسپکٹر، کتے اور بازار کے خیال میں گھرا ہوا۔ مزدور چٹان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا مال، اس کی متاع حیات، چاندی کا سکہ، جس پر بادشاہ وقت کی شبیہ کندہ تھی، چٹان کی تیز دھار پر اٹکا ہوا شبنم کے قطرے کی مانند چمک رہا تھا۔ مزدور تھکان سے چُور چُور ہو رہا تھا۔ اس میں اتنی بھی سکت نہ تھی۔ کہ سکے کو اٹھا لیتا۔ وہ شانوں کو جھٹک کر دُور کھڑا اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی کو ایک پُر اسرار مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتا دیکھتا گر پڑا —— مجبور و معذور مزدور چٹان کی تہہ میں ہر قسم کی بیگار سے بے نیاز بے خبر پڑا تھا۔

درشن

جس گاؤں میں اولا رہتی تھی۔ ایسا خوبصورت تھا۔ نہ بہت بُرا۔ وہاں درخت بھی بہت کم تھے اور جو تھے، وہ بے وجہ آنکھوں کو دُکھتے ہوئے نظر آتے تھے اور اس تپسوی کی طرح جو ریاضت کرتے کرتے سُوکھ کر رہ گیا ہو، مختلف آسن جمائے عبادت کا دم بھر رہے تھے! ہاں وہ دوشیزگاں جو قدیم آریاؤں کی بچی کھچی یادگاریں تھیں، غیر محسوس عریانی کے ساتھ چہل پہل کرتی ہوئی اس مختصر گاؤں میں ادھر ادھر ضرور نظر آتی تھیں اور ان کی آواز ہی تھی، جو کبھی شام کے سُونے منظر میں کوئل کی میٹھی میٹھی راگنیوں کا کام دیتی تھی

گاؤں ان کے دم سے زندہ تھا۔ جس کے سیدھے سادھے جھونپڑے، دُور بھی مالا کے بکھرے ہوئے دانوں کی طرح، رانچی جیسی مقدس بستی سے دُور، غار

کی طرح کھٹک رہے تھے؛ برہم تپر کی آنند موجوں کا شور، ان کے کانوں میں نہ آتا تھا۔ اور نہ اس پوتر جل کی مہکشنا، ان کے لیکھوں میں —— قسمت کی رتی نے لکھی تھی۔ برکھا ہوتی تھی، اسی پران کا جیون تھا۔ وہاں کوئی تہوار ہوتا۔ اور نہ گاؤں کے سادہ دل لوگوں کو اپنے ہاں تہوار منانے کا دھیان آتا۔ وہ بدھ مت کے کھلاڑی چھوت چھات پر دل لگائے بیٹھے تھے، انہیں جیت ہار کی ذرا فکر نہ تھی۔ ہاں وہ بڑے محنتی تھے، اپنے مویشیوں سے کسی طرح کم محنت نہ کرتے تھے، ان کی دُبلی تپلی سرخ وسیاہ ٹانگیں ہر وقت کھیتوں کو ناپتی ہوئی نظر آتی تھیں، باوجود اس مشقت کے بھی وہ دھیان گیان کے تپلے صبح وشام پوری کے مندروں میں جاتے، کبھی یگ مناتے، کبھی مندر کی سیوا سے دماغوں کی تھکن دُور کرنے!

وہ سادہ لوگ تھے، اور بزرگوں سے سنی ہوئی باتوں اور رٹے ہُوئے قانون پر جان دیتے تھے، جب یاترا ہوتی، پوجا پاٹ کے دن قریب آتے دھن کے بندے، دھن کا دھن الگ کرتے اور اس سنسار کو تیاگنے اور ویراگ کے لوبھ میں جیون کے خوش کرنے کو سب پونجی لے کر بے سوچے سمجھے تہوار منانے کو چلے جاتے۔ ستاروں کا ہیر پھیر، چاند سورج کا دور جب مٹھ کے پردھانوں میں طے پا جاتا، تو وہ جوق جوق گاؤں سے مندروں کی ہمت اُٹھ بھاگتے، جب گروہ کے گروہ ریوڑ کی صورت میں گاؤں سے رخصت

ہوتے تو انہیں یہ احساس ضرور ہوتا، کہ ہمارا گاؤں دیوتاؤں کے کرم سے اسی طرح دُور پڑا دکھ بھوگ رہا ہے جس طرح کسی راج رانی نے اپنے کنور کو تیاگ دیا ہو۔

ان دنوں جب وہ گاؤں سے چلے جاتے، تو گاؤں میں کچھ مویشی، کچھ بوڑھے اور اندھی لڑکی اُولا سمیت اپنے کرموں کا لکھین بھگتنے میں اونگھتے ہوئے نظر آتے۔

اُولا جو مادر زاد اندھی تھی اپنے خواب اور اپنی آرزوئیں اپنی ہم عمر الہڑ، ہمجولیوں کے سامنے بلک بلک کر بیان کر کے شکستہ ہو چکی تھی!

خدا جانے اسے کیا ضد تھی، وہ کیوں اس قدر بے کل تھی؟ خدا جانے اس کے اندر کیا تھا، جو اس کے من کو مسل رہا تھا! مندر کو جانے کا لوبھ، مندر کی یاد، کوئی کیا جانے اس کے من میں آنکھیں ناچ رہی تھیں!!

اُسے یہ تمنا تھی، اندھی کی ایک ہی تمنا تھی، کہ وہ پوری کے مندروں کو جائے، اور دیوتاؤں کے سینوں سے چمٹ کر آنند اور پریم کے پرتو میں کھو جائے،

اُولا کی آرزو، اُولا کی تمنا۔ بڑی مومن تھی!

وہ تاروں کی دنیا سے، آکاش کے دیوتاؤں کی سی بخشش، دھرتی کو بانٹنے آئی تھی، وہ سمجھتی تھی کہ میری روح مندروں میں سہمی ہوئی روشنی کی طرح دیوتاؤں

کے چرنوں میں چھپی بیٹھی ہے، وہ مندر ضرور جائیگی اسے اس امر کا یقین تھا۔ ہم لڑکیاں خصوصاً اس کی بہنیں، اس کی اس سُندر اچھیا پر برسوں سے ٹال مٹول کر رہی تھیں۔ یہ سلسلہ کب تک جاری رہ سکتا تھا۔ آخر وہ دن آگیا، اُولا سرخ اوڑھنی میں لپٹی ہوئی گاؤں سے نکلتی ہوئی مندر کو جاتی دیکھی گئی، وہ شلوک پڑھتی، گائن گاتی، لڑکیوں کے جھرمٹ میں اس باولے راج ہنس کی طرح گردن اُٹھائے جا رہی تھی جو کیلاش کی جھیل کو جا رہا ہو۔

اُولا کا ہاتھ اُترا کے ہاتھ میں تھا، جو اُولا کی چھوٹی بہن تھی۔ یہ دونوں ہم سفر کشاں کشاں مندر کو جا رہی تھیں، ساتھ والیاں بہت دُور نکل گئی تھیں۔ یہ دونوں پیچھے پیچھے ان کا منہ دیکھنے کو ترس رہی تھیں! ساتھ والیوں کو نہ اُولا کے سفر کی حقیقت معلوم تھی، اور نہ اس کی کسی امنگ میں کوئی دلچسپی تھی۔

اُترا چھوٹی تھی اور وہ بھی اُولا سے تنگ —— اُولا اُترا کو، اور کبھی اُترا اُولا کو کھینچتی، یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا، اُولا نے، جو محسوس کر سکتی تھی۔ بہت کوشش کی ہوگی۔ کہ میں اُترا کے لئے بوجھ نہ بنوں، مگر مجبوراً اولا نے اُترا کے کھچے ہوئے ہاتھوں کو اور محسوس کرتے ہوئے، بڑی احتیاط برتی کہ کسی طرح اُترا کی تکلیف میں کمی ہو جائے، مگر بے سود! لیکن اب اُترا اُولا سے اس قدر ناراض یا بیزار نہ تھی۔ اسے رہ رہ کر ساتھ والیوں پر غصہ آرہا تھا، انہیں اولا کے اندھے ہونے کا خیال تھا نہ اُترا کے چھوٹے ہونے کا دھیان، آخر

کب تک دو بندھی ہوئی کشتیاں جذبات کے بہاؤ میں چل سکتی تھیں ـــــ درد کی ماریاں ہار کر بیٹھ گئیں۔

اُترا نے کہا۔ اگر ہم اپنا مکھ مندروں سے موڑیں تو پاپ کا کارن بن جاتا ہے، جانے یہ منزل کب ختم ہو گی؟

اُدلا نے جھومتے ہوئے مقصد کی کھوج میں اُترا سے کہا۔ سمجھو اُترا یہ پرخار راستہ، اور گرم گرم دھول، پریم کی مایہ ہے۔ اب ہمارے بس کی بات ہے۔ جس قدر چاہیں لوٹ لے جائیں، میں مندروں میں دھرم کا پالن ڈھونڈنے نہ جاؤں گی، میں اپنے من کا اُبھار، جوبن مانے نہ رہے گا۔ مندر پہنچاؤں گی، اور یہ مکھ جو باہر سے سیاہ اور اندر ہی اندر درشن کی امنگ میں درپن ہو رہا ہے۔ اس ٹکسال پر ضرور پرکھنے جاؤ نگی، جو دیوتاؤں کی آگیا سے تیار کیا گیا ہے۔ یاد رکھو اُترا، تپسیا کی مالا مکھ کے کارن میں نہیں، وہ تو اندر ہی اندر آنکھوں کی اوٹ میں دانہ دانہ ہو کر پریم کا نام جپتی ہے۔ اب جہاں مورکھ ہٹول جو منہ موڑیں میرا تو وچار ہے یہ من جیسی جنس اُس سکھ کے استھان پر رکھ آؤ نگی، جہاں دیوتاؤں نے اپنے ناچنے کے لئے ایک اونچا استھان بنا رکھا ہے"۔

سانولی والیوں نے جب انہیں بہت دیر تک اپنے پیچھے نہ دیکھا تو انہیں اُدلا کی فکر ہوئی، انہوں نے اپنے اس کرم کو شرم سے دیکھتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں بنائیں، جیسا اکثر گاؤں میں اس کے سانولے کاری کاٹنے

کے لئے جمع ہو کر بنایا کرتی تھیں، مگر اُولا کو جس کی آتما کی بستی میں پریم کی شکتی بیٹھی الیشور کے گاین اور دیوتاؤں کی شبیہ تیار کر رہی تھی۔ اس راہ میں کیا سوجھا نادان، سر پٹک تو لٹا بیٹھی — یہ مادر زاد اندھی، پربھو کی دنیا میں اُڑنا چاہتی تھی، پر مندر بہت دور تھا کسی نے پوچھا، "اُولا مندر جاؤ گی تو کیا دیکھو گی"؟

کسی نے کہا۔ "اُولا تیرے من کی اچھیا پھولوں کی سی ہے"۔

کوئی کہتی، "اُولا پھولوں کو کیا سمجھے، پھول کیسے" اور پھولوں کے رنگ کیا ہوتے ہیں!"

اُولا کے دل پر ایک چوٹ لگی۔ درد بھری آواز میں بولی "پھول! ہاں میں کیا جانوں؟ ——— میں محسوس کر سکتی ہوں، سنو! میں خوشبو سے اُن کی روح تک پہنچ سکتی ہوں، اُن کے نئے نئے من مانے نام رکھ سکتی ہوں"!

کوئی نہ سمجھی، کوئی نہ سمجھی، کسی نے سنا، کسی نے نہ سُنا، مگر اُولا کو اپنی آرزوؤں میں کافی چمک نظر آئی، اور جس طرح سے بن پڑا اس تنگ پگڈنڈی پر اپنے خیالات سے اُلجھتی ہوئی پہنچ گئی۔

اُترا اولا سے اب ہمدردی برت رہی تھی، اور وہ سارے مناظر جو مندر کی راہ میں دیکھے جا سکتے تھے، اُولا کو سمجھاتے جاتی، اور جب اُولا مندر کا پوچھتی تو وہ اپنے کشادہ لبوں سے جھٹ کہہ دیتی۔ "مندر اب دُور نہیں، تم بہت جلد مندر کی سیڑھیوں پر سے گذر کر اس کے چھوٹے چھوٹے دروازوں میں سے ہوتی ہوئی

دیوتاؤں کے درشن کو پہنچ جاؤ گی۔

درشن! درشن کے لفظ نے اُولا کو اس پھول کی طرح تھرّا دیا، جو کسی درد والے پرند کی منقار سے تپتی پتّی ہو کر لرزتی ہوئی ٹہنی سے جُدا ہو گیا ہو! —— شاید اُولا کو آنکھوں کا خیال آیا جس سے اس کا منہ اُترا کی طرف پھر گیا اور قدم اُٹھنے سے رُک گئے۔

اُترا نے کہا۔" اُولا مندر دیکھنے کے قابل ہے، میں نے بھی ایک دفعہ دیکھا ہے، بڑا من موہن! راجہ کے ہاتھی کی طرح سجا ہوا جھومتا نظر آتا ہے۔ میں بہت چھوٹی تھی، مگر اس کی یاد اب تک تازہ ہے، جو کبھی بھولنے میں نہیں آتی، وہاں کچھ اندھیرا ہے اور اس میں روشنیاں ناچتی پھرتی ہیں!!"

اندھیرے کا خیال، اور مندر کی بناوٹ اُولا کو الجھن میں ڈال رہی تھی، کہنے لگی۔" کیا وہاں اندھیرا ہوتا ہے؟ اُترا جیسے میں تمہیں دیکھ نہیں سکتی"۔

اُترا نے کہا۔" اُس کے اندر اگربتیاں جلتی ہیں۔ دھوپ دُھکتے ہیں"۔

اُولا نے کہا۔" اگربتیاں جلتی ہیں۔ کیا دیوتا روشنی نہیں پھینکتے"۔

اُترا جس کے لئے یہ سوال بالکل انوکھا تھا۔ چپ تھی۔

ساتھ والیاں اب انہیں دیکھ بھی نہ سکتی تھیں مگر وہ دونوں ماں جائیاں برابر چلی جا رہی تھیں۔

اُترا نے کہا۔ ہم ساتھ والیوں سے اس قدر پیچھے ہیں، جس قدر وہ مندر کے

قریب!"

یہ سُن کر اُو لا نے اپنے قدم اس تیزی سے اُٹھائے، جیسے وہ پانی کی سطح پر تیر رہی ہو۔ اُترا نے سمجھا، اُولا کو پر لگ گئے ہیں۔ کیونکہ مندر کا نام اُولا کے کانوں میں ایک کرن کی طرح تڑپ کر نکل گیا۔ جس سے اسکے لبوں پر ایک پُر کیف تبسم نمودار ہوا، جسے اُترا نہ سمجھ سکی!

اُولا نے کہا۔ "اُترا میں اور میرا من اپنی اس تپسیا کو جو برسوں سے اس گھر میں جمع کر رکھی ہے، دیوتاؤں کے چرنوں میں، ناوانوں کی طرح گنگوں کی زبان میں پروان چڑھا آئیں گے، اور وہ اسے من میں رکھ کر اپنا اپنا سندر مکھ مجھ پریم باؤلی کے ماتھے پر رکھ دیں گے، میں لرزتی رہونگی، پھر اترا تم سمجھونا میں کیا سے کیا ہو جاؤنگی، اُترا میری اُترا، تم اس سمے میرے ساتھ میرے پہلو میں مالتی کے اس پھول کی طرح لگی جھومتی رہنا، جیسے آکاش کی رس بھری ہواؤں نے جھکا دیا ہو"!!

اُترا کیا سمجھتی اس نے ان درد بھرے الفاظ کے جواب میں صرف اُولا کا ہاتھ زور سے دبایا، اور وہ اتنے میں بہت دُور نکل گئیں۔

وہ اولا جس کے لئے ساری دنیا، ایک سپنے کی مانند مٹتی اور کھلتی جا رہی تھی، ایسی معلوم دیتی تھی جیسے کنول کے پتّے پر امرت بے کل ہو رہا ہو یا وہ دولت جو ایک کلی نے راز بنا کر چھپا رکھی تھی، گل کے پہلے ہی تبسم نے پریشان کر دی ہو۔

اُترا اور اُولا بہت دُور نکل گئیں، اُترا نے جلدی سے کہا۔ "اُولا لو مندر آگیا! وہ

سب سیڑھیوں پر ہمارا انتظار کر رہی ہیں"!

مندر کی سیڑھیاں، اُولا کے لئے بالکل نئی بات تھی، وہ بیٹھ گئی، اور بہت دیر تک انہیں ٹٹولا۔ اس نے وہاں کی مٹی چکھی، اس نے پیشانی پر راکھ ملی، پیشانی کو پتھر پر رکھا! —— صرف اپنی آرزوؤں کی تسلّی کے لئے اپنی روح کی تسکین کے لئے اس نے کیا کچھ کیا، یہ اسی کا دل جانتا تھا۔ وہ بے آہٹ دبے پاؤں چڑھتی گئی، اسے دروازوں سے آنے جانے کا دھیان تک نہ آیا، وہ ضرور سمجھتی تھی کہ وہ اپنی تمناؤں سمیت دھرتی سے اوپر ہی اوپر اٹھتی جا رہی ہے۔ اس کے پہلو میں ایک درد، ایک آس تڑپتی ہوئی، کروٹیں لے رہی تھی، اب وہ مندر کے عین بیچ کھڑی تھی، دیوتا اس کے سامنے سمادھی لگائے اک پُر اسرار مخمور ادائی میں محو تھے، وہ دیوتا تھے، جن کو سنگ تراشوں نے اپنے فن کے کمال سے لافانی بنا دیا تھا، حسن کی اچھوتا حدت کیسا تھا؟ اولا کے لبوں پر پھول کے موتیوں کی طرح لرز رہی تھی اور وہ اپنی سرد مہری میں گم، نازاں بازوؤں کو دبائے، خدا جانے کیا کچھ کر رہے تھے۔

وہ دیوتا تھے، جن کے سامنے اُولا کر کھڑی کر دی گئی تھی، اس کی خندہ پیشانی جس پر گندھے ہوئے بال پلکوں تک اور اکثر اس سے نیچے رخساروں تک پریشان پڑے بل کھاتے الجھتے رہتے تھے، آج وہ سلوٹیں لیتے، گرمی سے نہ کچھ سنتے کچھ دیکھتے بھی جاتے تھے!!

اُولا ابھی تک خاموش تھی، مگر اس کے اندر پریم کی دنیا جاگ رہی تھی اور وہ

ہو چپ چاپ، زیرلب تمناؤں کو لئے اس آنسو کی طرح رُکی کھڑی تھی جو پلکوں میں دھرتی کے اندر سما جانے کے لئے ڈھلکتا ہوا نظر آتا ہے!! شاید اس نے کچھ کہا بھی تھا، مگر پجاری اپنی مصروفیتوں کے کارن کچھ نہ سمجھے۔ اس کے لب ہلتے تھے۔ مگر انہیں کون سمجھ سکتا تھا۔

اُولا کا رواں رواں کھڑا تمناؤں کی لوچ میں دیوتاؤں کی دیا کو تک رہا تھا۔ اس کا دل جھکا ہوا دیوتاؤں کی دیا کا محتاج بے بس جھکا ہی جا رہا تھا۔ اس کا خون آنکھوں کی راہ میں بند افعی ناگوں کی طرح لوٹ رہا تھا۔

وہ اندھی تھی، اس کا کوئی آنسو نہ تھا، اسے یقین تھا، کہ دیوتا میری چپ کے جواب میں اپنے لمبے لمبے بازو، ممتا کے بازوؤں سے زیادہ بے کل، پریم میں گرمائے ہوئے میرے اردگرد پھیلا دیں گے جو ہوا کی طرح لہراتے ہوئے، مجھے اپنے چنگل میں لے کر دھکتے ہوئے سینے سے لگا کر اس لمس سے جسے میں اندھی مدتوں سے محسوس کر رہی ہوں، لپیٹ کر شانتی جیسی دولت سے ڈھانپ دیں گے!!
اور میں اپنی آرزوؤں میں لپٹی ہوئی آنند کی دنیا میں جہاں ان کے سوا کوئی نہیں، داسیوں کی طرح رقص کرتی نظر آؤنگی، یہ جذبات سے لبریز رقص، اُن کی مسکراہٹ اور میرے اطمینان کا پیغام بن جائیگا۔

اس نے یہ محسوس کرتے ہوئے اپنے پتلے پتلے خوشنما ہاتھوں کو دیوتاؤں کی طرح کھولا، اور بازوؤں کو اپنی آرزوؤں کی مانند کانپتے ہوئے اٹھایا جو ایک شدید

چوٹ کھا کر رہ گئے۔

جاتریوں اور پجاریوں نے عقیدت اور احترام کے خوف سے یک زبان ہو کر پکارا، "دیوتاؤں کو نہ چھونا دیوتا خفا ہو جائیں گے"۔

اُولا کے ٹوٹے ہوئے دل کی لغزشوں نے ٹٹولتے ہوئے کہا "یہ میرے گاؤں کے پتھروں سے بھی سخت کیا ہے، میں دیوتاؤں کا رس، اوتاروں کا پریم، برسوں سے محسوس کر رہی ہوں، میری رُوح اڑی جاتی ہے، دیوتا کہاں ہیں"؟

ایک پُر حسرت خاموشی چھا گئی، ایک سانس تک سنائی نہ دیتا تھا، جو اس کی بے چارگی اور مایوسی کی راہبری کر سکتا، اس نے کتنی بار کہا۔ اس نے بار بار ٹٹولا مگر پجاری چپ تھے اور سکوتِ کامل تھا اور وہ قوتیں جن سے زندگی، زندگی ہے، سکوت کے دھندلکے میں گُم ہوتی جا رہی تھیں!

اُس نے دبی آواز میں لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔ "دیوتا کہاں ہیں"؟ میں آنسو نہیں رکھتی، میں زبان ہی زبان رکھتی ہوں —— دیوتاؤں کے بازو کیوں نہیں کھُلتے؟ اور میں کیوں ان کے مقدس ہاتھوں میں اس ساز کی طرح نظر نہیں آتی، جو ہزاروں نغموں کا مخزن ہے، میں اپنے سوز میں دیوتاؤں کی سی آرزوئیں، من کے اندر بے نوری کے پردے میں چھپائے رکھتی ہوں —— اُترا تم چپ ہو؟ تم مجھے سرخ و سفید پھولوں کے فرق بتایا کرتی ہو، آؤ اُترا، اُو میرے ہاتھ دیوتاؤں کے ہاتھوں میں دے دو۔ میں خوابوں کی دنیا میں گُم ہوتی جا رہی ہوں —— اُترا میں مری جاتی ہوں!

دیوتا کہاں ہیں؟ دیوتا کہاں گئے —— لو دیکھو وہ روشنی، تیرے پریم کی ہی جوت،
میری اندھیری دنیا کی طرف بڑھتی آ رہی ہے، اُترا میں محسوس کر سکتی ہوں، بیان
نہیں کر سکتی، آہ! میں جنم کی اندھی! کیا دیوتا خفا ہو گئے ہیں؟ —— لو اور دیکھو
نورانی کرنیں مرے ارد گرد کمندیں ڈال رہی ہیں، لو وہ مجھ سے لپٹ گئی ہیں، اُترا
دیکھو تو سہی میری آنکھوں سے دیکھو!! —— تم چپ کیوں ہو؟ میں روشنیوں
میں تیر رہی ہوں، میرا قلب مسرتوں کے طوفان ہیں، ہزاروں آنکھوں سے مجھو
آنکھوں کی دنیا ہے اور وہ اس میں رقص کر رہا ہے اور میں بھنورے کے ساؤں میں
جال میں الجھی ہوئی مچھلی کی طرح اس دنیا کے کنارے پر پڑی سسک رہی ہوں
آہ میں سستا رہی ہوں ——"

یہ کون جان سکتا ہے کہ وہ کس کی گود میں پڑی سسک رہی تھی!! ——

ولی عہد

وہ میری ماں تھی، وہ ملکہ تھی، وہ اس تہ خانے میں رہتی تھی، جہاں ہم تم بیٹھے ان بھلے وقتوں کی یاد، اور ایک پرانی داستاں دہرا رہے ہیں، کل کی بات ہے لیکن معلوم ہوتا ہے جیسے صدیاں اس کے پیچھے چپ چاپ لبوں میں تبسم دبائے اندر ہی اندر کروٹیں لے رہی ہیں۔

یہ تہ خانہ، میری ماں اور ملک کی ماں، ملکہ کی یادگار ہے، اسے میر عمارت کے کمال نے بہشت بالکل بہشت بنا رکھا تھا۔ یہ تہ خانہ میر عمارت کا کمال، ایک ملکہ کے رہنے کی جگہ تھی، اُسے ملکہ نے آباد کیا تھا، یہاں کا ذرّہ ذرّہ ابھی تک کان لگائے ملکہ کے قدموں کی آہٹ، اس کی دیوانگی، اس کی ولولہ انگیز آرزوؤں پر پلکیں بچھائے احترام کے چند نقطوں کو درد کے دانوں پر ذہن سے گزار رہا ہے۔ ملکہ نہ آئے گی

بادشاہ اس کے تیئیں پیچھے چلا گیا ہے، وہ ملکہ تھی ——— ایک بادشاہ کی ملکہ!

بادشاہ جب اسے ملکہ کہتا، تو اس کے لبوں پر خون سے سینچے ہوئے پھولوں کی خوشبوئیں اُڑنے لگتیں، اور آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا جیسے فردوس کا رُخ پرور تذکرہ تجلیوں کی تہوں میں سے تڑپ تڑپ کر ایک بادشاہ کی زبان سے ادا ہو رہا ہو، سمجھ، وہ ایک بادشاہ کی صدا تھی، اور ایسے بادشاہ کی صدا تھی، جو اپنی ملکہ سے محبت رکھتا تھا۔ بادشاہ نے اپنی قسمت کو ملکہ کے دل میں کھولتے اور قہقہے لگاتے ہوئے ہزار مرتبہ سنا تھا، ملکہ نے بادشاہ کو کبھی رنج میں نہ دیکھا تھا۔ اس کا سبب وہ خود تھی، جس نے بادشاہ کو اپنے حسن اور سیرت سے ایک جام بھر کر پلایا اور ایسا محو کر دیا تھا کہ بادشاہ اپنے آپ کو ایک بادشاہ جاننے اور سمجھنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ وہ رعیت کا باپ اور دلوں کا حکمران ہے!

آہ ایسی ملکہ جیسا میں نے بیان کیا ہے اس تہ خانے میں رہتی تھی، سنو سنو، اس طرح بے صبروں کی طرح آنکھیں نہ پھاڑو، بابوسوں کی طرح لب نہ کھول دو، تعجب کی کوئی بات نہیں یقین جانو، ملکہ اسی تہ خانے میں رہتی تھی، جہاں اندھیرے اور روشنی کو بغلگیر ہوتے اس قدر مدت گذری ہے کہ ان کا ملاپ ایک دہم بن گیا ہے، اور وہ ایک دوسرے پر تنقید کرنے کے ناقابل ہو گئے ہیں۔ جب کبھی وہ ایک دوسرے پر سے گذرتے ہیں، تو بڑی بڑی مکعب شکلیں جو ان کی ناچاقی سے پیدا ہوتی ہیں، نظر آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کوئی قدیم خزانہ آہستہ آہستہ

سرک رہا ہے اور ملکہ اس دھندلے میں کنڈلی مارے اس امانت پر بیٹھے ہوئے سانپ
کی طرح دکھائی دیتی ہے جس کی آنکھیں دیکھتے دیکھتے تیز شعلوں کی مانند آرزوؤں
سے بھی دُور نکل گئی ہوں۔

ملکہ اکثر دیواروں سے لگی ہوئی اس روشن دان کے نیچے جس پر "کُل نفس
ذائقۃ الموت" جلی قلم میں لکھا گیا ہے، کھڑی شور مچایا کرتی تھی، اور وہ جملے جسے
میں اور تم نہیں سمجھ سکتے، اس کی زبان سے خاموش فضا میں، ایک خاص ترنم سے
نکلتے سنائی دیتے تھے، جیسے ہوا میں فرشتوں کے پر کھل رہے ہوں، یا کوئی ملکہ اور
بادشاہ خراماں خراماں قدم اُٹھائے آرام گاہ کی طرف جا رہے ہوں، آہ وہ جملے
جو ملکہ نے دیوانگی میں کہے۔ اس قدر پُر اثر تھے کہ اب تک اُن کے سننے سے قلب
میں بے کلی اور روح میں بے چینی سی محسوس ہونے لگتی ہے، جب وہ تھکان سے
ذرا سستانے لگتی، یا یوں کہو، خاموشی اس پر سایہ کر دیتی، تو یہ ساری جگہ سہم جاتی
اور کبھی کبھی کوئی ایسی آواز سنائی دیتی، جیسے ممتا موت سے تکرار کر رہی ہو اور
بادشاہ بے اولاد باپ کی طرح دُور کھڑا زور زور سے سانس لے رہا ہو اور
سلطنت لاوارث بچے کی طرح پنجوں سے دودھ چوس رہی ہو —— وہ پُر معنی
الفاظ ایک بڑے خوش نویس نے جو بادشاہ کا منظورِ نظر تھا۔ صرف اس غرض
سے لکھے تھے کہ وہ دیوانے کی دیوانگی پر فتح پا لے گا۔ تم یقین جانو وہ معطر الفاظ
وہ عقیدت سے بھرے ہوئے الفاظ پڑھنے تو در کنار (ملکہ دھن کی ایسی دیوانی تھی)

کر اس نے دیکھے تک بھی نہ تھے۔ دیکھتے ہو نا، کیسے خوبصورت خطِ طغرا میں لکھے گئے ہیں۔ میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میرے بال بالکل سفید ہو گئے ہیں، مگر خوش نویس کے کمال، اور لفظوں کے پیوند میں سرمو فرق نہیں آیا۔۔۔۔ سمجھو اب انہیں کون مٹائے گا، وہ کس کا کلام ہے، کیا لکھنے والے نے اسے غیر فانی بنا دیا ہے۔

آہ ملکہ نے ایک دن بھی تو صبر سے کام نہ لیا، کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت پڑھو جب بھی پڑھو۔ پڑھنے سے تسکین اور اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے، لیکن مضطرب اور بے چین ملکہ کے لئے کوئی بات بھی تسکین کا باعث نہ تھی!

ملکہ میری ماں تھی، بادشاہ نے مجھے بالکل ولی عہد کی طرح پالا تھا، ویسی ہی تعلیم دلائی تھی، میرا سینہ روشن ہے، میری عقل جذبات کے ماتحت نہیں ہے۔ میں ولی عہد کے ساتھ کھیلا ہوں۔ وہ میرا بھائی تھا، اور میں اس کا ساتھی، میرے نام سے اس کے چہرے پر روشنیاں دوڑنے لگتی تھیں، ملکہ اور بادشاہ سب مجھے چاہتے تھے۔ آہ میرا وہ بھائی خدا کے پاس چلا گیا، وہ کیوں چلا گیا، اُسے کیوں بُلا لیا گیا۔ ملکہ کیوں دیوانی ہو گئی۔ یہ سب راز ہی راز ہے۔ اب یہ تہ خانہ ہے اور میں ہوں جہاں مجھے زندگی کے دن ابھی گذارنے ہیں، کبھی مجھے یہ احساس تھا کہ میں نے ملکہ کی خدمت کی ہے۔ مجھے اس نے پالا تھا۔ بادشاہ نے مجھے چاہا تھا۔ یقین جانو، اب میں بدنصیب اس دنیا میں تنہا ہوں۔ اب مجھے احساس بھی نہیں رہا کہ انہوں نے مجھے پالا تھا، یا میں ولی عہد ہوتا، اب تو یہ جگہ بھیانک

نظر آتی ہے اور نہ یہ خیال ہوتا ہے۔ اور نہ اب میرے آنسو ایسے ہیں کہ اس کے غم کا اظہار کر سکیں۔ یا اتنی ہمت کے ساتھ کوئی ایسا شکوہ کر سکیں کہ ماتا پھر بھڑک اُٹھے

آہ جب وہ اس تہ خانہ میں لائی گئی ہیں اِس کا محافظ مقرر ہوا۔ یہ امتیاز یہ انتخاب بڑے فخر کی بات تھی، جو ساری سلطنت سے میرے حصے میں آیا جب وہ اپنے ایک بچہ کے مر جانے پر عقل و ہوش کھو بیٹھی تھی، تو اس تہ خانے میں لائی گئی تھی، وہ اس تہ خانے میں، دیواروں اور ستونوں، اور صبح کی لمبی لمبی کرنوں سے اپنے سوالوں کا جواب طلب کیا کرتی تھی، وہ ان کے سامنے مظلوموں کی طرح گڑگڑاتی تھی اس کی حالت ناقابلِ برداشت اور رلا دینے والی تھی۔ وہ سرخ تانبے کی زنجیر جو اوپر گنبد کی حفاظت کے لئے لٹکائی گئی تھی، ملکہ اسے زور زور سے ہلاتی تھی، اور خود ہی اس پر ہنس پڑتی تھی، اور جب وہ آہستہ آہستہ دم توڑتے ہوئے سانپ کی طرح رینگنے لگتی یہاں تک خوفزدہ ہوتی کہ اکثر —— آنسو نکل آتے کیا میں اسے بھول سکتا ہوں۔ تم اس قدر ہمدرد ہو۔ خوف زدہ نہ ہوتے جاؤ۔ وقت گذر گیا ہے سوچو تو میرے لئے کس قدر صدمہ ہے۔ میں ولی عہد تھا۔ وہ میری ماں تھی، وہ ایک ملکہ تھی، وہ ایک دیوانی ملکہ تھی!

ولی عہد کی موت کے بعد تہ خانے کی ساری زندگی میں ملکہ نے مجھے میرے نام سے کبھی نہیں پکارا، آخر ملکہ میری ماں تھی، اس نے مجھے اپنے بچوں کی طرح پالا تھا، یہ دیوانگی کی انتہا ہے کہ ملکہ نے کبھی مجھ پر ولی عہد کا دھوکا نہیں کھایا جب

تک وہ تہ خانے میں رہی اسے اس محسوس دنیا میں اسی کی تلاش تھی لیکن دنیا اس سے خالی تھی، آہ میں بھی ولی عہد سے محبت رکھتا تھا جسے ملکہ نے دیوانگی سے چندروز پہلے بستر مرگ پر ہچکیاں لیتے ہوئے دیکھا تھا تم ایک دیوانے کی ہیئت سمجھتے ہو۔ تم نے پروانوں کو روشنی کی طرف جاتے دیکھا ہے' دوست کیا تم نے دیوانوں کو لوگوں پر دانت پیستے ہوئے دیکھا ہے' ہاں اسی طرح وہ بڑے بڑے فرزانوں کا مقابلہ کرتے ہیں، اور اپنے مقصد میں رنگے ہوئے بندے دیوانے کہلاتے ہیں۔

وہ ملکہ جس کا بچہ کھو گیا تھا۔ بالکل پاگل ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو اس کی یادگار میں پاگل بنالیا تھا۔ شاہی اور ملکی حکمانے ولی عہد کی موت سے متعلق بہت کچھ مایوس الفاظ اور پیشین گوئیاں کی ہونگی۔ مگر بادشاہ حکومت کے تحکمانہ اعتماد میں ملکہ کے گہرے محسوسات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یقین رکھتا تھا کہ ولی عہد تخت پر بیٹھے گا میرا جانشین ہو کر ملکہ کی دنیا میں پھر ایک بار بہار لائیگا۔ ملکہ ماں تھی، مامتا کی دنیا اس کے لئے خالی تھی، وہ ان آنسوؤں میں ایک شبیہ دیکھتی تھی، جو جلد جلد مٹی کی طرف گرتے اور بگڑتے جاتے تھے، آخر کب تک؟ انجام کار ملکہ خاموش ہو گئی، اس کے آنسو خشک ہو گئے، وہ دیوانی ہو گئی لیکن اس کے زخم خوردہ دل سے ولی عہد کی یاد کبھی نہ بھولی، اس کے ٹھکرائے ہوئے دماغ نے ساری دنیا کو اطمینان سے خالی پایا۔

بادشاہ نے ملکہ کو کبھی نہیں بھلایا تھا، وہ اس کی دماغی فرحت کے لئے ہر صبح و شام سرخ نیلے اور سبز رنگ کے پھول بھیجا کرتا تھا۔ مجھے علم ہے۔ بادشاہ نے دیدہ دانستہ ملکہ کے لئے زرد اور سفید پھول کبھی نہیں بھیجے آہ ملکہ پر ولی عہد کی موت نے ایک دیوانگی طاری کر رکھی تھی۔ وہ بادشاہ کے بھیجے ہوئے پھولوں سے زرد اور سفید رنگ کے پھول ڈھونڈنے میں اس وقت تک مصروف رہتی، جب تک وہ مرجھا نہ جاتے، اور رنگ نہ بدل لیتے،

میں خوب سمجھتا تھا۔ ملکہ کو ولی عہد کا چہرہ اور کفن آخری دم تک یاد تھا۔ مجھے نیند آتی تھی، تو میں آہستہ آہستہ سوچا کرتا تھا، میں اس کا محافظ تھا۔ مگر ملکہ جب تک تہ خانے میں رہی میں نے اُسے کبھی سوتے ہوئے نہیں دیکھا، بادشاہ جب کبھی آیا اُسے یہی کہتے ہوئے سُنا، عنبر گذشتہ کی دل شکن یاد دُور کر نیکی بہترین دوا ہے۔

ایک رات، جب چاند ستاروں میں گم ہو گیا تھا اور ہزاروں ستارے کسی دوسرے قطب میں بیٹھے، اپنے پُر اسرار ہونے کی داستان ایک دوسرے کو سنا رہے تھے، جیسا میں بیان کر چکا ہوں، ملکہ کبھی نہیں ستایا کرتی تھی۔ اب وہ ستا رہی تھی، غنودگی آئی۔ اور میں گہری نیند سو گیا، مجھے یاد ہے وہ روزن جہاں سے مؤذن کی صدا آتی ہے اور اس کے کچھ دیر بعد ایک ٹمٹماتا ہوا ستارہ دکھائی دیا!

آسمان میں سرخی دوڑنا چاہتی تھی، میں نے اس صبح تہ خانے کو گم شدہ نغمے کی طرح سسکیاں بھرتے ہوئے پایا، وہ سامنے والا دریچہ جہاں ایک بوسیدہ قالین

سینکڑوں مُرجھائے ہوئے پھولوں کی بکھری ہوئی پنکھڑیوں کی طرح مٹی سے مٹی ہو رہا ہے، میں نے وہاں ملکہ کو نہ پایا ـــــ اور وہ پہلی صبح تھی، جب میں نے اپنے آپ کو کھلی ہوا میں پایا، اور بہت جلد اپنے آپ کو ایک ایسے درخت کے نیچے کھڑا محسوس کیا، جس کے بازو کھلے آسمان میں ایک قطب سے دوسرے قطب تک پھیلے ہوئے اس بات کی منادی کر رہے تھے، کہ وہ ہاتھ جس نے ہم کو بنایا، خدائی ہاتھ ہے، ہر طرف رنگ رنگ کے پھول تھے، طائر نغمے بلند کر رہے تھے، خوشبوئیں وجد کر رہی تھیں، درخت عروس کی ایک چادر بنا ہوا تھا۔ ملکہ اس کے نیچے اپنے آپ سے لپٹی ہوئی سمٹی ہوئی پائی گئی، اس کے آغوش میں ایک معصوم بچہ تھا۔ ملکہ اسے کیوں لپٹائے ہوئے تھی؟ اس نے اسے کس طرح سے حاصل کیا؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدف نے کھویا ہوا موتی، تازہ اور حسین موتی حاصل کر لیا ہے اور اب اپنی سیپیوں کو سکیڑ لیا ہے ـــــ ملکہ اپنے سانس ختم کر چکی تھی۔ شاید ولی عہد نے اسے بلا لیا تھا۔ گریبان چاک ملکہ، معصوم بچہ، اس کے رخساروں پر، لبوں پر سفید سفید چکنے چکنے دھبے۔ بچے کے لبوں کا ہلنا، ملکہ کی پلکوں سے ایک رُکے ہوئے آنسو کا گرنا۔"

ہاں بچہ، زندہ بچہ، بادشاہ نے اس کو اٹھا لیا، وہ ولی عہد ہوا، آج کل وہی بادشاہ ہے ـــــ اور مہرجہ وہ بادشاہ کے متعلق کوئی نہیں جانتا وہ کس کا بچہ ہے۔

گاڑی بان

جب گاڑی بان لایا گیا، تماشائیوں نے ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ مختلف قسم کی آوازوں کے درمیان کبھی کبھی ایک ایسی آواز سنائی دے جاتی جیسے کوئی نیچے چیخ رہا ہو۔

گاڑی بان تفکرات میں کھویا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کے قدم بھاری معلوم دیتے تھے، یہ مختصر سا راستہ اس کے لئے ایک دشوار گذار منزل سے کم نہ تھا۔

وہ حاکم عدالت کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا گیا۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ لوگوں کی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں، وہ سب کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن کسی کو پہچان نہ سکتا تھا آخر ایک قانون دان نے اس کی طرف سے ایک درخواست پڑی جس میں اس کے

بچوں اور بیوی کی طرف سے آنسو بہائے گئے تھے۔

"کیا تم مجرم ہو؟ عدالت نے پوچھا"

قیدی نے نگاہ اٹھا کر سامنے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اُمید کی دھیمی دھیمی روشنی جھلک رہی تھی۔ اس نے جرأت سے کہا "جی نہیں —— میں مجرم نہیں ہوں۔ ایک سیدھا سادا گاڑی بان ہوں۔ گاڑی بانی میرا آبائی پیشہ ہے میرا باپ بھی گاڑی بان تھا، بڑا دیانت دار۔ ابھی تک عزت سے یاد کیا جاتا ہے اس نے اپنی زندگی میں سزا پائی نہ کبھی جرم کیا، لوگ کہتے ہیں۔ وہ ایک صحیح قسم کا گاڑی بان —— صرف گاڑی بان تھا!"

"جی ہاں گھوڑا گاڑی میرا ہے لیکن میرے سر پر کچھ قرض بھی ہے۔ کچھ دن ہوئے میں نے اپنی لڑکی کی شادی کی ہے۔"

"میرا داماد؟ —— وہ ایک بڑھئی کا لڑکا ہے، خود بھی بڑھئی کا کام کرتا ہے۔ میں مطمئن ہوں —— وہ بڑا خلیق ہے، چھوٹے بڑے سب کی عزت کرتا ہے۔

"جی ہاں جو کچھ بیان کروں گا، حلفیہ بیان کروں گا۔"

"میں اس پیشہ کو پسند کرتا ہوں یا نہیں، یہ میری موجودہ حالت سے پوچھئے"

"جی نہیں میری زندگی میں یہ پہلا موقع ہے۔ کہ میں یہاں اس رسوائی سے لایا گیا ہوں"۔

"یہ غلط ہے۔ کہ میں سزا یافتہ ہوں، نہ میرا باپ سزا یافتہ تھا۔ نہ میں کبھی گواہی دینے یہاں آیا ہوں"۔

"نشہ؟ جی نہیں، ہاں جوا ضرور کھیلتا ہوں، لیکن وہ بھی سال میں ایک بار، اس کا نتیجہ اچھا ہو یا بُرا، یہ میں ہمیشہ قسمت پر چھوڑ دیتا ہوں"۔

"قول و فعل کا پابند ہوں، جو کچھ کہوں اس پر پورا اُترنے کی کوشش کرتا ہوں"

"یہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جو کچھ بیان کرونگا، حرف بحرف درست ہوگا"۔

"شام ہو چکی تھی، میں روزی کی فکر میں کھڑا، آنے جانے والوں کا منہ تک رہا تھا، میرے ہاں اولاد کی کثرت ہے، میں روزی کمانے میں کچھ غیر معمولی طور پر لالچی واقع ہوا ہوں، جب اڈے پر کھڑا ہوتا ہوں۔ یہی خیال کرتا ہوں کہ جو آتا ہے میری طرف آتا ہے —— تاریکی پھیل رہی تھی، میں نے اپنے پیچھے ایک آواز سنی، آواز میں ایک دبدبہ تھا۔ میں نے بے چینی سے پلٹ کر دیکھا، مجھے یقین تھا۔ میری روزی کھچی آرہی ہے۔ سردی کی شدّت سے فضا میں دھند اور غبار تھا، سواری سر سے پاؤں تک ایک بڑا لبادہ اوڑھے، میرے پیچھے کھڑی تھی —— میں نے پوچھا" آپ کہاں جائیں گے"؟

"جوار کے قریب"۔

میں جوار کا نام سن کر کانپ اٹھا۔ لیکن سواری بیٹھ چکی تھی اور میں گھوڑا چلانے پر مجبور تھا — میں نے اپنے دل سے کہا۔ جوار بہت دُور ہے۔ بہت ہی دُور

دریا کے اس پار گھنے درختوں میں، جنگلوں کے درمیان۔ جہاں انتقام کھلم کھلا کھیلتا ہے میرے بچے، میری دنیا، میرے فرائض، سب میری یاد سے ایک آوارہ لہر کی طرح بل کھا کر گذر گئے، میں بالکل خاموش تھا۔ اتنا بھی خیال نہ کر سکا، کہ یہ کام اس سنسان اور بھیانک رات میں میرے لئے کس قدر مشکل ہو گا۔ جو راجس کا نام سن کر دن کے وقت بھی دل خوف کھانے لگتا ہے۔ پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں، مجھے وہاں جانا ہے، آخر اس وقت وہاں کیا ہو گا۔ جہاں سانپ زہر اُگلتے ہیں اور مہیب درندے اپنی خوفناک آوازوں کے ساتھ دھاڑتے ہیں۔

"میں گھوڑا ہانکے جا رہا تھا، میں نے کہیں دُور کچھ روشنی دیکھی، جیسے چراغ ٹمٹما رہا ہو، پھر کھنڈروں کے نشان۔ ایک گنبد کچھ شکستہ دیواریں، یہ سب مجھے یکے بعد دیگرے نظر آئے، اور میرے خوف و ہراس کو ایجاد کرنے میں مددگار ہوئے اس ضمن میں جو جو خیالات میرے ذہن میں آئے، میں انہیں محض وہم سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر میں نے جرأت سے منہ پھیر کر سواری کو دیکھا، سواری نہایت مطمئن ——— میری پیٹھ سے پیٹھ لگائے بیٹھی تھی ——— میں گاڑی کے ہچکولوں کے باوجود اپنی جگہ پر بیٹھا تھا۔ مختلف قسم کے خیال سرعت سے میرے ذہن میں رنگ رنگ کی تصویریں بن کر آ رہے تھے ——— یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں کمزور ہوتا جا رہا ہوں ——— میں اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ وہم ہے۔ تم گاڑی بان ہو ——— یہ تمہارا آبائی پیشہ ہے تمہاری

اور تمہارے بچوں کی روزی کا وسیلہ — اندھیرا ہے، تو کیا؟ — دُور جانا ہے تو کیا؟ یہ مزدوری ہے۔ گاڑی بان کا کام سواری کو اس کے مقام تک پہنچانا ہے۔ اگر تم اپنا کام دیانت داری سے انجام دوگے، تو تمہارا حق تمہیں مل جائیگا۔

میرے دل نے اس قسم کے بہت سے دلائل پیش کیے، مگر وہم جو میرا تعاقب کر رہا تھا۔ سحر سے کم نہ تھا۔ سواری کی وحشت خیز خاموشی، بھیانک خواب کی طرح میرا گلا دبا رہی تھی، میں مضطرب تھا، حلق سے آواز تک نہ نکلتی تھی، گویا قوتِ گویائی کھو چکا تھا — بعض اوقات کچھ ایسا محسوس ہوتا۔ کہ گھوڑا گاڑی سواری سب کا بوجھ مجھ پر ہے اور میں ان کے نیچے روندھا جا رہا ہوں۔ گھوڑا ڈگر پر برابر بغیر کسی بے چینی کے چلا جا رہا تھا۔ اس تمام عرصے میں کوئی بات نہ ہوئی — نہ میں نے سواری کو مخاطب کیا، نہ سواری نے مجھ سے کوئی سوال کیا، جس کا میں جواب دیتا۔

ہم دریا کے پل پر سے گذر چکے تھے۔ گاڑی کے پہیوں کی آواز بلند اور کچھ آشنا سی معلوم ہو رہی تھی، آخر کار سواری کو مخاطب کرنے کی غرض سے، میں نے دیدہ و دانستہ گھوڑے کو غلط راہ پر ڈال دیا، مجھے پورا یقین تھا۔ کہ سواری اس پر معترض ہوگی اور میں فوراً۔ جلدی جلدی تین چار سوال کر دونگا، اور جس طرح بھی بن پڑا اپنے وسوسوں کو اطمینان سے بدل لونگا۔ اس وقت میرے لئے بہترین موقع ہوگا کہ میں اس کا اور اس کے ارادوں کا غور و خوض سے مطالعہ کروں۔ اور جو ارجانے

غرض و غایت کو سمجھ لوں میں نے بار بار اس کی طرف دیکھا۔ لیکن اس کی خاموشی میں ذرا فرق نہ آیا۔ دریا کا پُل چھوڑتے ہی اس نئے راستے پر پہنچ کر، مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ کوئی غار ہے جس میں ہم اندھا دھند چلے جا رہے ہیں اگر یہ راہ ایک غار ہی ہے، تو یقیناً اس کا کہیں اختتام بھی ہوگا۔ وہاں موت کے قہقہے فضا میں چکر کاٹ رہے ہونگے، اور ان دہشتناک ہنگاموں میں زندگی ناممکن ہوگی ——

"کبھی یہ خیال آتا کہ ہم کھڑے ہیں۔ دریا کا پانی ہمارے پاؤں کے نیچے پھیل گیا ہے کبھی یہ تصوّر ہوتا۔ کہ گھوڑا گاڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر بہت دُور نکل گئی ہے۔ اور میں بغیر کچھ سوچے سمجھے بھاگا جا رہا ہوں۔ اس تصوّر کو تکمیل دینے کی خاطر میں نے چاہا۔ کہ گھوڑا گاڑی کو چھوڑ کر دیوانوں کی طرح بھاگ نکلوں —— میری بیوی کن حسرتوں کے ساتھ میری راہ تک رہی ہوگی، کمسن بچوں کی یاد، ان کی باتیں پھر روزی کا خیال، اور یہ خوف کہ اگر میں ایسا کرونگا تو سواری کا خوفناک پنجہ میری گردن پر ہوگا۔ میں گھٹ کر مرجاؤنگا، میرے بچوں کی دنیا اندھیر ہو جائیگی۔ چلتا گیا میں ان وسوسوں اور الجھنوں سے گذر رہا تھا۔ مجھے ایسا احساس ہوا کہ کوئی آدمی سسکیاں لے رہا ہے، کیا یہ میری سواری کی آواز ہے —— میں نے پلٹ کر دیکھا، لیکن سواری گنگوں کی طرح خاموش، لہروں کی طرح بے پروا، اور اندھوں کی طرح بے حرکت تھی —— لنڈ منڈ درختوں کے خوفناک سائے۔ دور دُور دکھائی دے رہے تھے، گھوڑا ذرا بھی تھکا ہوا معلوم نہ ہوتا تھا۔ نہایت

وفادار۔ بڑا طاقتور، میری روزی کا ذریعہ، محنت و مزدوری کا سہارا۔ سب کچھ وہی تھا ــــ وہ اپنی رفتار چلا جا رہا تھا۔ میری منزل میرے وہم و گمان سے دور خدا جانے، ہم کہاں سے کہاں گذر رہے تھے، ہر طرف پریشانی ہی پریشانی تھی۔ کوئی اس مصیبت میں پرسانِ حال نہ تھا اور سواری کی مستقل خاموشی نے، میرے حواس پر قبضہ کر رکھا تھا ــــ کرتا تو کیا کرتا؟

سردی کی وجہ سے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ باگ تھامنے کی بھی طاقت نہ رہی تھی، ہاتھ ٹھنڈ کے مارے سن ہو چکے تھے۔ اس مایوسی کی حالت میں ہم ایک ایسی جگہ پر پہنچے جہاں سے دو راستے الگ الگ ہونے تھے، یہاں ایک نڈر انسان نہایت مضبوط اور توانا ملا، وہ آگے بڑھا اور میرا گھوڑا تھام کر بولا۔ ادھر کوئی راستہ نہیں، گھوڑے کا رُخ بدلو، میں فقط اس کے پاؤں دیکھ سکتا تھا۔ ــــ بڑے بھدے اور بھاری بھاری کھیتی باڑی کرنے والوں کے سے معلوم ہوتے تھے۔ غالباً کوئی کاشتکار تھا۔ اس کی صورت سے وحشت ٹپکتی تھی۔ اس کی آواز نہایت کرخت تھی، میری یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں اس نے تحکمانہ طور پر کہا۔ تم کون ہو؟ وہ پیچھے کون ہے؟ کہاں سے آئے ہو، کہاں جاؤ گے ــــ میں بے حس و حرکت بیٹھا زبان میں قوتِ گویائی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں وہ بولا۔ یہ جگہ وہ ہے، جہاں شہری لوگ برسوں دیکھنے میں نہیں آتے۔ تم اس تاریک اور سرد رات میں اندھا دھند کدھر جا رہے ہو

میں نے کہا ہم جوار کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ پیچھے میری سواری ہے، اور میں خود ایک غریب گاڑی بان ہوں —— وہ کچھ جواب دیئے بغیر لپک کر گاڑی پر پیچھے سواری کے ساتھ جا بیٹھا اور ترش آواز میں بولا، گاڑی کا رخ بدلو! جوار اس طرف نہیں، گاڑی کا رُخ بدلنے میں شاید کچھ تاخیر ہوئی ہوگی کہ وہ اپنی جگہ سے چونک کر اٹھا۔ اور گاڑی سے کُود پڑا۔ اس نے گھوڑے کو لگام سے پکڑ کر اس کا رُخ دوسری طرف بدل دیا اور خود گھوڑے کے ساتھ قدم قدم چلنے لگا۔ جب گھوڑا رفتار پکڑ چکا، اور راہ پر ہو لیا تو پیچھے بیٹھنے کی بجائے میرے ساتھ آ بیٹھا —— مضبوط اور زندہ انسان خوف زدہ معلوم ہوتا تھا۔ مجھ میں قدرے قوت آ گئی تھی، میرا حوصلہ بڑھ گیا —— یہ ضرور کوئی مزدور ہے میں بھی مزدور ہوں۔ یہ میری مدد کریگا، اور وہ راز جو خوف اور دہشت بن گیا ہے۔ دیکھتے دیکھتے فاش ہو جائیگا لیکن میرا خیال بہت غلط ثابت ہوا، مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے بھی زیادہ خوف زدہ ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا جسم سرد ہوتا جا رہا تھا۔ غالباً وہ کانپ رہا تھا۔ اب صرف گھوڑے کے قدموں اور اس کے ہانپنے کی آواز آ رہی تھی، کون تھا جو میری راہبری کرتا، ہم تینوں یقیناً علیحدہ علیحدہ اپنے انجام پر غور کر رہے تھے۔

وہ راستہ جو میں نے انتہائی پریشانی سے کاٹا تھا۔ پھر دوبارہ جوں توں کر کے نصف سے زیادہ ختم ہو چکا تھا۔ کسان نے میرے بازو پر زور سے چٹکی لی۔ قریب تھا کہ میری چیخ نکل جائے میں نے اپنے آپ کو اس کے رحم پر چھوڑ دیا۔ اس نے

پوچھا۔ "یہ پیچھے کون ہے"۔ میں نے کہا "میں نہیں جانتا"۔ وہ بولا، خاموش میں سب کچھ جانتا ہوں ——— کبھی کبھی وہ بے سبب مجھ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کرتا کبھی میرے ساتھ لگ جاتا کبھی ادھر دیکھتا کبھی ادھر دیکھتا، کبھی میرا منہ تکنے لگتا ——— اب گھوڑے کی باگ اس کے ہاتھ میں تھی، وہ گھوڑے کو جلدی جلدی چلا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بڑے بڑے تھے، بالوں کی بناوٹ عجیب قسم کی تھی۔ چہرہ غیر معمولی وجاہت اور صحت کے سبب چمک رہا تھا۔ بے فکری اور تازہ ہوا میں پلا ہوا جسم پتھر کی مانند نظر آتا تھا۔ لیکن سواری کی دہشت سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اس پر سحر کر دیا ہے۔ وہ اپنی پریشانی کو ہر امکانی کوشش سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہم آہستہ آہستہ دوبارہ پل کے قریب پہنچ گئے۔ درختوں کے ڈراؤنے اور گھنے جھنڈ ختم ہو چکے تھے۔ میں دعا مانگ رہا تھا کہ سلامتی سے پل پر پہنچ جاؤں گھوڑا گھاٹی پر اس طرح چڑھ رہا تھا۔ جیسے موت اس کا تعاقب کر رہی ہو، وہ جگہ پھر آگئی تھی۔ جہاں سے میں نے دیدہ دانستہ اپنے لئے غلط راستہ اختیار کیا تھا۔ میں نے سواری کو دیکھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا جیسے کوئی رو رہا ہو ——— یکایک جھٹکا لگا۔ گویا پہیئے کے نیچے کوئی پتھر آگیا تھا۔ قریب تھا کہ ہم سب گر جاتے، سواری نے گردن اٹھائی میں نے بڑی جرأت سے کاشتکار کو کہا ——— یہاں سے جوار کتنی دور ہو گا۔ کیونکہ ہمیں جوار جانا ہے میری آواز کسی قدر بلند تھی، اس میں ایک

قسم کی تندی اور حوصلہ پایا جاتا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ موت سے زیادہ میرے لئے کچھ نہیں۔ کاشتکار میری آواز سے چونک اٹھا۔ میں نے سواری کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس میں ایک بے بسی اور بیکسی نظر آتی تھی —— اس کی حالت نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ میں نے اس کی آنکھیں دیکھیں، ان میں ایک چمک تھی اور وہ خوبصورت تھیں!

پُل کے قریب ایک پرانا درخت تھا جس کے نیچے سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں، غالباً مسافر تھے، رات وہیں ٹھہرے ہونگے۔ کاشتکار کے الفاظ مجھے ابھی تک یاد ہیں، جوار بہت دُور ہے، وہاں قتل وخون کی خوفناک وارداتیں ہو رہی ہیں تم وہاں تک نہیں پہنچ سکتے، سرکاری ملازموں نے اس کے گردو نواح میں گھیرا ڈال رکھا ہے، وہاں سے نہ کوئی آسکتا ہے اور نہ جا سکتا ہے —— یہ کہہ کر گاڑی سے کُود پڑا۔ اور سواری کو بڑے غور سے دیکھتا ہوا بغیر کچھ کہے درختوں کی آڑ میں گم ہو گیا۔

اُب تمام ماحول بدل چکا تھا۔ میں نے ہوشیاری سے گھوڑے کو جلدی جلدی چلانا شروع کیا، اس کا رُخ شہر کی جانب تھا۔ سواری ابھی تک اپنے خیال میں سرنگوں تھی۔ مجھے اب اس سے ہمدردی سی پیدا ہو گئی تھی —— ہم پل چھوڑ کر بہت دُور نکل آئے تھے، وہ یقیناً رو رہی تھی۔ شاید اس کی کسی بڑی آرزو کو ٹھیس لگی تھی لیکن میرے دماغ میں ایک ہی خیال چکر کاٹ رہا تھا کہ رات ختم ہو جائے اور میں گھوڑا گاڑی

لے کر گھر کی راہ لوں۔ میرا بدن تکان سے چور ہو چکا تھا۔ رات قریب الاختتام تھی شہر کے آثار کچھ کچھ نظر آنے لگے تھے، میری حالت پہلے سے بہت بہتر تھی یکایک مجھے معلوم ہوا کہ کسی نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا ہے میرے تمام جسم میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ خاموش فضا میں ایک تیز چیخ گونجی، اس ہراس کے عالم میں، میں نے کاشتکار سے مدد چاہی لیکن وہ جا چکا تھا۔ اس کا گرم گرم جسم اور پھولا ہوا سانس اب کچھ بھی باقی نہ تھا۔

گاڑی چلتے چلتے خود بخود رک گئی، میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اور زمین پر گر پڑا، گھوڑے نے اپنا منہ ہمدردی سے مجھ پر رکھ دیا۔ یہ کچھ یاد نہیں کہ میں کب تک بے حس و حرکت پڑا رہا۔ جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا زمین پر چاندی کے کچھ "سکے" گرے پڑے ہیں، اور ایک سایہ جیسے چاند بادلوں اور درختوں کے پیچھے سے گذر رہا ہو سڑک کی دوسری جانب جا رہا تھا۔

یہ واقعہ اس جگہ پیش آیا تھا جہاں ایک شکستہ گنبد اور چند قدیم دیواریں اپنے بنانے والوں کی یاد میں کھڑی آنسو بہا رہی ہیں، کوئی آواز کوئی آہٹ سنائی نہ دیتی تھی، میں گھوڑا گاڑی سنبھال گھر کی طرف روانہ ہوا، تکان اور ڈر کے مارے بالکل ناطاقت ہو چکا تھا، گھوڑے کی رہی سہی طاقت سے آخر میں گھر پہنچ گیا۔ بچے بے خبر سو رہے تھے، دروازے پر میری بیوی بیٹھی اونگھ رہی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ تمام رات اس نے میری راہ دیکھتے دیکھتے کاٹ دی ہے۔ میں مصیبت میں گرفتار

مُردے سے بدتر، دل میں ہمت نہ پاؤں میں سکت، چارپائی تک پہنچ کر چت لیٹ گیا

کون بتا سکتا ہے، مجھے خود معلوم نہیں اس کے بعد کیا پیش آیا تھا۔ صرف اس قدر یاد ہے کہ دن چڑھ چکا تھا۔ میری بیوی نے مجھے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا، اور گاڑی کے پاس لاکر کھڑا کر دیا —— میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ گاڑی خون سے لت پت ہو رہی ہے اور سپاہی میرے اردگرد کھڑے ہیں رات کے تمام واقعات میری آنکھوں کے سامنے یکے بعد دیگرے گذر رہے تھے میں خاموش بے حس و حرکت کھڑا گاڑی کو تک رہا تھا —— اور خون آلود گاڑی میرے سامنے کھڑی تھی!

"لوگ جوق جوق آرہے تھے۔ ہجوم کافی سے زیادہ جمع ہوگیا تھا۔ یہ واقعات جو میں نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے، کسی کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔

ایک نے کہا۔ "یہ گاڑی بان کا کام ہے"۔

دوسرا بولا —— "یہ جوار کیونکر پہنچا"؟

"اس نے جاگیردار کو کس طرح قتل کیا"؟

"اس نے کس کی مدد سے کامیابی حاصل کی"؟

.... کہتے ہیں، موما شہر کی مشہور رقاصہ جاگیردار کی داشتہ کل شام تک شہر کے بازاروں میں موجود تھی!

جزیرہ ماہرو کا پھول

جُزیرہ ماہرو ——— یہ اس جگہ کا نام ہے جس سے دنیا، دنیا کے بادشاہ حکومتیں اور مختلف قسم کے لوگ مدتوں سے فیض حاصل کرتے چلے آتے ہیں، اسے شہرت دنیا، اس کو آباد دیکھنا لوگوں کے نزدیک اپنے وقار کو کم کرنا ہے، بہت سی خصوصیات کے باوجود وہ ایک ایسی جگہ ہے جو بستیوں سے دُور ابھی تک گمنام چلی آتی ہے۔ بڑے بڑے ماہران طب، فلسفی اور کیمیا گر اس کی مٹی سے سونا، چاندی اور جواہر پیدا کرنے کی غرض سے وہاں پہنچتے ہیں اور جب انہیں کچھ نہیں ملتا تو اپنا سامنہ لے کر وہاں سے چل دیتے ہیں۔ میں اسی جزیرہ ماہرو کا رہنے والا ہوں مجھے اس سرزمین سے پیار ہے سمجھو اس سرزمین کو مجھ سے الفت ہے، اس سے متعلق سب کچھ جانتا ہوں، پر کہتا یہی ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ سمندر کا غصہ اس

کے لئے بھی ہے، وہاں بھی طوفان آتے ہیں لیکن آج تک وہ تہ آب نہیں ہوا وُہ عشق اور جنون کی ایک دنیا ہے جو فردوس سے کم نہیں، وہاں بھی چاند، سورج ستارے دکھائی دیتے ہیں۔ غم و غصّہ اور فکر کا وہاں نام و نشان نہیں، ہاں کشمکش حیات ضرور ہے —— ماہرو! آہ مجھے جنت سے بھی زیادہ پیارا ہے۔ اس کے پھول تمہاری دنیا سے الگ پریم میں بسے ہوئے رنگوں میں مختلف شکلوں میں مختلف حسین آنکھوں کی طرح دیکھتے ہوئے، لبوں کی طرح کچھ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں، محسوسات سے لبریز دل انہیں سمجھ سکتا اور ان کے متعلق بیان کر سکتا ہے۔ اگر میں تمہیں ایک پھول کی خصوصیت اور اس کے رنگوں کی تشریح سناؤں تو دیوانے ہو جاؤ!" —— محفل میں سب محوِ حیرت اس کا منہ تک رہے تھے۔

"وہ پھول سال بھر میں بغیر کسی موسم اور وقت کی قید کے ایک بار پیدا ہوتا ہے، وہ ایک ایسا پھول ہے جو ماہرو کے سوا دنیا کے کسی حصے میں پیدا نہیں ہوتا اگر کوئی اسے اتفاقیہ دیکھ پائے، تو بے ساختہ کہہ اٹھے، کہ اس پھول میں دیکھنے کی قوت اور دوشیزہ کی سی پاکیزگی پائی جاتی ہے، کہتے ہیں ایک بار اگنی دیوتا سمندر کے ساحل پر روپ دیوی کو پریم کی گود میں بیٹھے ہوئے دیکھ کر، اپنی فطرت سے مجبور ہو کر برانگیختہ ہو گیا تھا، اس کے بازو اس طرح کھل گئے جیسے سمندر کی لہریں جوش میں آکر ناگوں کی طرح پھن کھولے ہوئے اٹھ اٹھ کر لپکتی آئیں، وہ ایک تیز اور تند شعلے کی طرح جھپٹا۔ اس سے بچنے کی خاطر روپ اور پریم، سمندر کے اُوپر ہی اُوپر

بہت دور تک اڑے تاکہ وہ اس کی نظر سے اوجھل ہو جائیں۔ مگر اگنی دیوتا نے ان کو اپنے بازوؤں میں لے لیا، اور جزیرہ ماہرو کی خاک پر ہمیشہ کے لیے انتقام کی آگ سے جلا کر راکھ کر دیا۔ شاعر واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، سپاہی کا دل پسیج جاتا ہے، مگر دیوتاؤں کا غصہ نہیں ٹلتا۔ محبت اور نفرت کا وجود صرف ہمارے تمہارے تصورات تک محدود ہے، دیوتاؤں کے ہاں یہ چیزیں نہیں ملتی، اور نہ انہیں اس کا احساس ہے۔ کب کا واقع ہے، کس طرح ہوا اور کیوں ہوا، کوئی بیان نہیں کر سکتا، اس پھول کی پیدائش کے متعلق جو کچھ برسوں کی محنت اور علم سے حاصل کر سکا ہوں، وہ صرف اسی قدر ہے۔

روپ اور پریم غصہ کو برداشت نہیں کرتے، خلوص اور لطافت ان کی زندگی ہے، اور وہ پھول جیسا کہ میں بیان کر رہا تھا۔ ہمیشہ اُن کی یاد کو تازہ کرتا رہتا ہے تم اسے دیکھ پاؤ، تو مسکرانے لگتا ہے۔ سہم بھی جاتا ہے اور اپنی نازک پتیاں کسی پُر کیف جذبے میں کھولے، ایسا معلوم دیتا ہے کہ وہ انہیں تمہارے گلے میں ڈال دے گا۔ میں اور وہ برسوں سے آشنا چلے آتے ہیں۔ کون یقین کر سکے گا کہ میں ٹھیک بیان کر رہا ہوں کیونکہ شکل و صورت سے تو میں ابھی ناتجربہ کار اور وہی کچھ ہوں جس میں جوانی کی علامات پائی جاتی ہیں، مگر حقیقت میں میری عمر اس وقت دو صدیوں سے بھی زیادہ ہے۔ میری آنکھوں نے کتنی بادشاہتیں اور انقلاب دیکھے ہیں دنیا والوں نے فطرت پر قابو حاصل کرنے کی غرض سے ان گنت

ایجادیں اور کوششیں کی ہیں، انسان کو ان کوششوں سے اکثر خاطر خواہ کامیابی بھی نصیب ہوئی اور فطرت کا سر جھک گیا، مگر یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ابھی فطرت اپنے اندر بہت کچھ چھپائے ہوئے ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے علم، عمل، عمر اور وقت کی ضرورت ہے۔

وہ پھول جو میرے اور دنیا کے درمیان ایک راز ہے، اس سے بڑے بڑے فلسفی بے خبر ہیں، اس کا رنگ زردی مائل سرخ ہے، جس میں ایک سیاہ آنکھ کی سی پتلی دکھائی دیتی ہے، عین وسط میں ایک شوخ سرخ داغ نظر آتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے اس سرخ داغ میں ایک آنسو کی مانند چمک پیدا ہوتی ہے اور وہ جھک جاتا ہے، جھکنے کے ساتھ ہی سیاہ پڑ جاتا ہے، پھر پتی پتی ہو کر زمین پر بکھر جاتا ہے، اس وقت اس کی خوشی صرف اس قدر ہوتی ہے کہ میں اسے ایک دفعہ چوم لوں اور دفن کر دوں، چنانچہ میں اس کی ہر ایک پتی کو چن لیتا ہوں اور انہیں الگ الگ بوسہ دے کر دفن کر دیتا ہوں۔ اور جب مجھے اس کو زندہ رکھنا، یعنی فروخت کرنا مقصود ہوتا ہے کیونکہ اسے بیسیوں دفعہ فروخت کر چکا ہوں تو اس کے مرجھانے سے پہلے اس پر اپنے لب رکھ کر اسے شاخ سے الگ کر لیتا ہوں۔

جزیرہ ماہرو کی جب صبح یا شام کو اسے نکل کر سربلند ہونا ہوتا ہے، فضا کے اندر ایک جھنک سی پیدا ہوتی ہے۔ پھر ہلکی ہلکی اور بھینی بھینی خوشبو سمندر کی مرطوب ہواؤں میں بس کر ماہرو کی فضا میں دور نزدیک سب جگہ پھیل جاتی ہے۔ چرند پرند درخت

پتّے، چٹانوں تک کو یہی محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اوتار جنم لے گا۔

یہ پھول بہت سی خصوصیات رکھتا ہے جب کبھی کوئی بادشاہ کسی رقاصہ کے فریب میں پھنس کر دیوانہ ہو جاتے، تو وہ اسے بچا لیتا ہے۔ اور اگر کوئی آوارہ مزاج شہزادہ کسی بڑے بادشاہ کی شہزادی پر فریفتہ ہو کر قابو حاصل کرنا چاہے، تو یہ پھول ہی اس کے کام آسکتا ہے۔ بہت سے شہزادے اور بادشاہ اس پھول سے آشنا ہیں۔ انھوں نے اسے دیکھا ہے۔ ان کے پاس میں نے اسے فروخت کیا ہے جس کسی کے پاس یہ پھول ہو گا کامیابی اس کے لئے موت کی طرح یقینی ہے۔ میں اس کا مالک ہوں۔ میں تم سب کو یہ پھول دکھا دیتا۔ تم دیکھ کر نئی زندگی پاتے اور درازیٔ عمر کی دعا مانگتے۔" یہ پہلا موقع ہے کہ اس پھول کو ایک عورت نے اپنی محبت کی تلخی کو مٹانے کی خاطر طلب کیا ہے۔ گویا میری زندگی میں یہ پہلا دن ہے کہ ایک عورت نے اسے خریدا ہے۔ کتنے ہیں مرد بار بار محبت کرتا ہے۔ لیکن عورت صرف ایک بار۔ جب میں نے پھول کے سامنے کھڑا ہو کر کہا۔ کہ اب کی بار میں تجھے ایک شاہزادی کے لئے حاصل کر رہا ہوں، تو وہ خلافِ معمول جھومنے لگ گیا۔ اس نے ایک سانس لیا جس میں ہزاروں خوشیاں اور آرزوئیں پوشیدہ تھیں، ایک قطرہ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں امرت کی طرح، سرخ داغ کے اندر سے ابھرا، اور میں نے اسے شاخ سے الگ کر کے گود میں رکھ لیا، وہ جوں کا توں میرے پاس موجود ہے جس کے لئے لایا ہوں اسے پہنچانے جا رہا ہوں۔ اس بارہا ناشت کے ہوتے ہوئے میری خوشی

اور دیوانگی کی کچھ انتہا نہیں، میں اس قدر خوش ہوں۔ کہ جو لب پر آتا ہے کہے جاتا ہوں اور اس خوشی کے باعث اس کی بیتابی کے سبب بے خوف و خطر بول رہا ہوں"۔

جزیرہ ماہرد کا باشندہ جب یہ سب کچھ بیان کر رہا تھا۔ ایک نوجوان جو شکل و صورت اور آنکھوں سے صحرا نشین معلوم دیتا تھا محفل میں اونگھنے لگا اور کچھ اس طرح سے اونگھا کہ منہ کے بل گر پڑا۔ شہادت، مقصود و مطلوب یہی نظر آتا تھا کہ سب قوتیں ایک ہی مرکز پر جمع ہو رہی ہیں، وہ کشادہ رو درد دل سے کراہنے لگا۔ اور کہنے لگا۔

میں اس پھول کے پیچھے مارا مارا پھر رہا ہوں، میرا پیشہ اور میری زندگی کا مقصد یہی ہے۔ عشق کا حاصل اور عقل کی شکست، انسان کی ناتوانی کے سوا کچھ نہیں، عورت کو معراج ملے گا۔ یہ خوشی روح کی تسلّی کے لئے کسی صورت کم نہیں، وہ عورت نہیں، شاہزادی ہے، اس کی فغاں بے ثمر رہے، پھول کا مالک اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں رحم آلود اور ہمدردانہ انداز میں اُٹھیں اور اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے اس کو گود میں لے لیا اور کہا مردوں کے حوصلے بلند اور عورتوں کے دل نازک ہوتے ہیں، محبت مرد کے لئے سنگ راہ ہے، عورت کی دولت پر قبضہ کرنا مرد کی شایانِ شان نہیں، وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا، کہ ایک عورت جس نے اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک ایک لبادے میں چھپا رکھا تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ میں نے اپنی شیریں عمر کی ایک ایک گھڑی گن گن کر گذاری ہے۔ یہ پھول میری ملکیت ہے اسے میں نے ہی منگایا ہے میں شاہزادی ہوں میرا نام خدیجہ ہے!

شاہزادی کے بیان نے محفل کا ہر انداز بدل دیا تھا۔ وہ دنیا ہی اور نظر آنے لگی تھی، ماہرو کا پھول، پھول نہ رہا، وہ ایک مٹھی بھر خاک تھی، صحرا نشین عشق باز نے کہا "شہزادی خدیبہ"، شاہزادی کی آنکھیں جھک گئیں، ماہرو کا باشندہ پھول کا مالک بولا ——یہ نیلگوں آسمان، یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ خوبصورت اور ناقابل حل فطرت، یہ کائنات اور خود انسان، روپ اور پریم کے بندھنوں میں بندھے ہوئے بے بس اور مجبور ہیں"!

مُرقع

بستی سے دُور وہ کھنڈر جہاں ہر شب پروں کے پھڑ پھڑانے کی آوازیں سنائی دیتی رہتی تھیں، راہبوں کی طرح ہونٹوں کو سیئے تکان سے چُور، بے زبان کیسے پُر اسرار معلوم دیتے تھے، خدا جانے وقت نے انہیں کیا پڑھا دیا تھا کہ وہ لب پر لب رکھے خاموش دنیا کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ بستی اس پُر اسرار ماحول سے دُور زندگی کی جدوجہد کے ساتھ اپنے ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتی رہتی تھی اور ان کو اس کی پُر شور زندگی، جس پہ وہ نازاں تھی، اس کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔

بستی کے رہنے والوں میں ایک سیدھا سادھا انسان نمو تھا جس نے اپنی زندگی کا بہترین حصّہ ان کھنڈروں کے چھیڑے ہوئے سینے پہ دل رکھے گزار دیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ان کھنڈروں کے آنسو اندر ہی اندر گھوٹتے رہتے ہیں اور وہ ہماری

گئی گذری تہذیب کی یاد کو تازہ رکھتے ہوئے، ہم جو زندگی کا دعویٰ کرنے والے ہیں، ان کے لئے اطمینان کا سامان بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔

قمرو کو دنیا مختلف نگاہوں سے دیکھتی تھی، مگر وہ دھن کا پکا، دنیا کو اپنی نگاہ سے دیکھتا، اپنی منزل کی طرف سیدھا جا رہا تھا —— یہ نظریہ قائم کرنے میں اسے کس نے مدد دی تھی؟ —— یہ کوئی تبلا نہ سکتا تھا! بستی بستی تھی۔ وہ کھنڈروں میں آتا جاتا، کسی بڑی تہذیب کا پیغامبر معلوم ہوتا تھا۔ بستی کے رہنے والوں میں بہت کم ایسے تھے جو قمرو کا دم غنیمت جانتے، وہ یہ بھی جانتے تھے، کہ وہ ایک غیر فانی سرمایہ، ایک قدیم یادگار، علم و فن جیسی دولت پر چلتے پھرتے دیوتا کی طرح حکومت کر رہا ہے!

قمرو اپنی دیوانگی اور دوراندیشی دونوں پر یکساں خوش تھا۔ اس نے فتح و شکست کے احساس کو مٹا دیا تھا، وہ فتح پر ہنستا تھا، نہ شکست پر روتا —— وہ یقیناً قمرو تھا جس نے دیوانگی میں سب کچھ چھپا رکھا تھا —— اور وہ فرض جس کے لئے فطرت نے اس کا انتخاب کیا تھا۔ بڑی دیانت داری سے انجام دیئے جاتا —— اس کا حسنِ عمل اس کی شکل و صورت اور عادات سے زیادہ نمایاں تھا اور پُراطمینان تھا۔ یہ پُرکیف روشنی اس کی پیشانی کا نور تھی، وہ اس سے مضطرب تھا، مگر اسی میں محو تھا۔

قمرو جانتا تھا۔ اس کے جذبات میں ایک دن غیر معمولی تلاطم آئیگا۔ اور وہ

دنیا کے سامنے اپنی مضطرب تمناؤں کو عریاں کر دیگا، وہ جانتا تھا مقصد حیات کے ساتھ نا انصافی کرنا زندگی کو گمراہ کرنا ہے۔ اور اپنے آپ سے انتقام لینا ہے—— ایسے اور بھی بہت سے نظریئے تھے جن میں اسے اپنی دیوانگی کو تکمیل دینے میں مدد ملتی تھی۔ وہ کھنڈروں کے درمیان جب اپنا فرغل اوڑھے ہوتا، تو یوں معلوم ہوتا، کہ ایک ایسے درخت کا سایہ ہے، جس نے صدیاں محسوسات، اور تفکر جیسی دولت میں کھڑے کھڑے گذار دی ہیں۔ وہ گاؤں کے ننھے ننھے بچوں میں کچھ ایسا مل جل جاتا، گویا ایک مست قلندر اپنی لے میں جھوم رہا ہے، اور بچوں کی ماؤں نے انہیں نہایت حسن و ادا کے ساتھ کی گود میں ڈال دیا ہے —— تمرد کی تعریف اس کے اثبات کا فخریہ بیان اور وہ کیفیت جو اس کے دیکھنے سے دلوں پر ہوتی اس بات کا ثبوت اور اظہار تھا، جو تمرد کی فطرت نے اپنے لئے چنا تھا۔ وہ اپنے یقین پر حکومت کر رہا تھا، اس کے ذوق نے ہر شخص کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ تمرد دیوانہ نہ تھا، وہ یہ بھی جانتا تھا—— میں دیوانہ ہوں، میں کیوں دیوانہ ہوں، دنیا مجھے کیوں دیوانہ سمجھتی ہے؟

وہ اپنے تاریک دیوان خانے میں، جسے اس نے اپنے عمل سے جنت بنا رکھا تھا، بیٹھا ان مشکلات کا حل کبھی کبھی سوچا کرتا —— یہ جو میں نے ایک نئی دنیا بنا رکھی ہے، میرے دکھ درد کی تسکین ہے۔" اس نے کہا "مجھے اپنے دکھ درد کی تسکین کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے"۔

اس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ اس کی رفیقۂ حیات کو جدا ہوئے عرصہ گذر چکا تھا، وہ

سمجھتا تھا یہی میرا سہارا ہے، یہی میری دولت ہے۔ یہی میرے بچے ہیں، یہی میرے اعمال میری آرزوؤں کا پھل لائیں گے۔

قمرو جس قدر سادہ دل واقع ہوا تھا، شکل و صورت بھی ویسی ہی سادہ پائی تھی۔ اس کے سر پر عجیب و غریب تراش کی ٹوپی رہتی۔ خیال ہوتا کہ قدیم زمانے کے قالین کا ایک بوسیدہ ٹکڑا ہے، جو قمرو کے سر پر گھراتیوں اور نظموں کا مجموعہ بن گیا ہے۔ کبھی کبھی مرزائی پہنتا، کبھی فرغل نما چغہ پہنے رہتا، جس پر مغلئی کارچوبی دیکھنے کو بے سرو پا مگر آنکھوں میں کھبی جاتی تھی، لوگوں کی ذہنیت کا مقابلہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ جب دیکھو اس کا شکستہ ڈھیلا ڈھالا چغہ، چیتھڑے اس سے اس کی تاریخی داستان سننے کا تقاضا کر رہے ہیں، درد کا مارا قمرو درد کی تصویر بڑی دیانت داری سے، وہی داستان، جو پہلے کتنی بار دہرا چکا ہوتا، اسی دلچسپی سے انہی الفاظ میں، متانت کے ساتھ بڑی سنجیدگی سے بار بار بیان کرنے پر بھی نہ اکتاتا۔

دنیا کچھ کی کچھ ہو جائے قمرو صرف "قمرو" تھا، وہ چکر، جس پر اس نے اپنی قسمت کو چڑھا دیا تھا، الٹا، سیدھا چلا جا رہا تھا، دھن کا پکا۔ بڑا ظالم تھا، کوئی کتبہ یا پتھر، کوئی جواہر یا زمرد یا مرقع، آثار قدیم کا کوئی نشان مل جاتا، تو معصوم بچے تک کا گلا گھونٹ کر بھی حاصل کرنے سے دریغ نہ کرتا ——— یہ سنگ دلی اس کی تعریف تھی، اسی پر وہ زندہ تھا۔ جب اسے کسی ایسے مرقع کا پتہ چل جاتا، جو مغل دربار کی رونق رہا ہو، کسی بادشاہ کے جشن سالگرہ پر پیش کیا گیا ہو یا جس پر بابر جیسے نقاد

بادشاہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہو جس پر کسی عجمی مصوّر نے اپنا نام، اپنا عمل لکھ دیا ہو۔ بادشاہ نے دستخط کئے ہوں، محافظ نے مہر لگائی ہو، زرفشاں، مطلا صفحوں اور سنہری خطوط سے مرصع ــــــ وہ اضطراب و بے چینی کی تصویر، بے چین بن جاتا ہے، اُس وقت اس کا حاصل کرنا، اسے دنیاوی نعمت سے زیادہ اطمینان بخش اور روح پرور معلوم ہوتا۔

وہ ایسی فضاؤں میں رہتا تھا، جہاں مغل شاہزادے، شہزادیاں، عجم کی مغنیاں، دوشیزگان عرب، سبز پوشاک پہنے، تاج اور الحمرا جیسی فضا میں فرشتوں کی طرح پر تولتی رہتی تھیں اور ساقی چاندنی رات میں خیام اور حافظ کے پیمانوں میں سرورِ حیات بھر کر سوز و گداز سے لبریز دلوں پر نچھاور کرتے رہتے تھے وہ غیر فانی نغمے جو مجاہدوں نے موت کے سایہ میں چلتے پھرتے گائے تھے، وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا رہتا تھا ــــ اس نے ہزاروں ایسی روحیں دیکھی تھیں، جو کھنڈروں کی پر معنیٰ خاموشی میں مختلف شکلوں میں بل کھائے، سرِ شام اونگھنے لگتی ہیں، کھنڈر پر شکوہ، سکوت کے ساتھ چپ بیٹھے گویا خاموشی کے دیوتا، چپ سادھے، دھرتی کے سینے پر تپسیا کرتے کرتے پتھرا گئے ہیں، وہ خاموش تھے، وہ فرد کو دیکھتے، فرد انہیں دیکھتا تھا۔ وہ ان میں اس قدر گھل مل گیا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ وہ ایک واحد ہستی ہے، جو ان کا حاصل ان کی زبان سمجھتی ہے۔

ایک رات جب تمام کائنات سو رہی تھی، وہ خاموش دھرتی کے سینے پر،

کھنڈروں کے درمیان، بالکل ایسے جس طرح کوئی رحمت سے ہمکنار ہو کر جا رہا ہو، چلا جا رہا تھا، اس کا پر معنی سایہ کھنڈروں کے درمیان اس طرح اُٹھتا بیٹھتا دکھائی دیتا، جس طرح لہریں ساحل سے دُور گھٹتی بڑھتی دکھائی دیتی ہیں، بڑے بڑے شکستہ ستون، اونچے اونچے مینار، اظہارِ عقیدت میں بازو کھولے جانے والے کی راہ تک رہے تھے، پر قمر آج کی رات کچھ اور کا اور تھا، بہتے ہوئے پانی کی طرح اپنے اُوپر جھکے ہوئے، درختوں کے سایہ سے جھوٹے عہد و پیمان باندھتا سرکتا جا رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ فرغل میں چھپائے رینگتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ باوجود اس کی آنکھوں میں اطمینان موجود تھا، پر وہم میں گھرا ہوا، پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ کھنڈروں سے بہت دُور نکل آیا تھا، ان کا تصور اس کی نگاہ سے آہستہ آہستہ محو ہو رہا تھا۔ لیکن وہ پیچھے مڑ مڑ کر لگاتار دیکھتا جاتا تھا، بستی کے پرپیچ راستوں پر اب اسے آنے جانے والوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں، اس کی لرزش اس کشمکش میں زیادہ نمایاں ہوتی جاتی تھی وہ اپنی کمزوری اور ان یادوں کو جو جلد جلد اس کے ذہن میں آتی جاتی تھیں، چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید وہ اپنے آپ کو بھی چھپا لیتا، لیکن درختوں کے بیشمار پتے دھیمی روشنی میں بیشمار آنکھیں بن گئے تھے، آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنے کی اسے جرأت نہ ہوتی تھی۔ وہ خیال کر رہا تھا، ستارے کچھ کہہ دیں، شاید وہ اس راز کو پا گئے ہیں جس کو میں چھپانے کی کوشش میں ٹھوکریں کھاتا چلا جا رہا ہوں — اسی کشمکش میں جب وہ گھنے درختوں سے گذر کر ہزاروں شبہات اور موہوم خیالات

کا مقابلہ کرتا ہوا کھلے میدان میں پہنچا، جہاں بستی گہری نیند سو رہی تھی، اس کے چہرے پر ایک خوشی نمودار ہوئی، اور اس نے پلٹ کر اپنے مستقبل کو اپنے قدموں کے نشانوں پر تلاش کرنا چاہا۔ اور اپنے ارد گرد دنیا کے محیط پر، جہاں تک اس کا ذہن، اس پر سکوت فضا میں اس کو لے جا سکا تھا۔ اسے ایک دہشت محسوس ہوئی۔ اس نے پھر اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے ایک نیا فریب تراشا —— میں اب بہت دور نکل آیا ہوں، وہ راستہ ختم ہو گیا ہے، جہاں میرے قدم بھاری معلوم دیتے تھے۔ میں بے خوف و خطر کس تیزی سے دُور آ پہنچا ہُوں۔ میں ایسی منزل سے گذر آیا ہوں، جہاں خوفناک جرم اور خودکشی کی وارداتیں ہوا کرتی ہیں۔ اب بستی کی ساری طاقت میرے ساتھ ہو گی، وہ میرے حق میں آواز بلند کریگی۔ کون ہے جو میری حفاظت کے لئے اپنے آپ کو قربان کرنے سے دریغ کریگا —— وہ یہ کہہ کر رُک گیا، اور بڑے اطمینان سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا اور اپنے آپ کو تسلّی دیتا ہوا پھر آگے بڑھا۔ مگر جن خیالات نے دل و دماغ پر قابو پا رکھا تھا۔ کب پیچھا چھوڑتے تھے۔ بغل کے اندر اس نے ہاتھوں کو حرکت دی، کچھ ٹٹولتا ٹٹولتا تن گیا، جیسے کوئی حربہ کسی غیر معمولی تعجب سے تکنے لگے۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا، کہ وہ پوری کوشش کر رہا ہے، کہ کوئی قوت اس کی خوشی کا اندازہ نہ کر سکے، جو اس کی روح کی گہرائیوں میں کروٹیں لے رہی ہے۔ یہ سب کچھ میری باقی ماندہ زندگی کا سہارا ہے میں اس کی پوری پوری حفاظت کرونگا —— یہ سوچتے ہی عجیب خیالات

اور وسوسوں نے پھر اس پر غلبہ پا لیا، اور اس لنڈ منڈ درخت کے سائے کی طرح جو کھنڈروں کے درمیان شکستہ روزنوں سے آنے والی روشنی کو دیکھ کر کانپ اُٹھے بستی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا ——— وہ اکثر ایسے موقع پر پُر معنی اور پُر اسرار بن جایا کرتا تھا، وہ یقین رکھتا تھا، اور دل ہی دل میں کہتا تھا ——— میں کھنڈروں سے آشنا ہوں۔ وہ مجھ کو پہچانتے ہیں ——— ان کی بقیہ یادگاروں میں یہی ایک باقی رہ گیا تھا۔ کھنڈر بہت دُور رہ گئے ہیں۔ میں ابھی ابھی بستی میں داخل ہو جاؤنگا وہاں بالکل خاموشی ہو گی، گھروں کے چراغ، چراغ سحر کی طرح ٹمٹما رہے ہونگے نہ کوئی بچہ ماں کے پہلو سے جُدا دروازہ پر میری راہ دیکھتا ہو گا۔ میں ہونگا اور میری دنیا، یہ مختصر راستہ بھی طے ہو جائیگا۔ میں اپنے دروازے کا قفل کھول کر بغیر اِدھر اُدھر دیکھے اندر داخل ہو جاؤنگا، اور اندر کی طرف بغیر کسی خطرہ اور رخنہ کے، وہ بڑا قفل جو عرصہ ہوا میں نے جہاں آباد کے ایک گوشہ نشین شہزادے سے خریدا تھا

سانس کے آگے جانے سے پہلے لگا دونگا۔ اور یہ مرقع جو میرے بازوؤں کے درمیان ناقابل برداشت بوجھ بن گیا ہے۔ اس شال کی تہوں میں چھپا دونگا جس پر مریم زمانی کا نام دربار کے کسی بڑے کارچوب نے منقش کیا ہے۔ ہاں یہ کہنا بھول گیا تھا۔ کہ میں اس پر اپنی نہر لگا دونگا ——— وہ میرا ہے۔ ہمیشہ کے لئے میرا ہو جائیگا۔ اس موقع پر وہ بڑے اطمینان سے قبا کھولی۔ مرقع دیکھ کر مسکرایا۔

اس کی آنکھیں چمک گئیں۔ وہ کانپ اٹھا۔ شاید اس نے دُور تاریکی میں کسی کو اپنے پیچھے آتے دیکھ لیا تھا۔ جن تاثرات اور جذبات کو وہ چھپانے کا عادی تھا۔ رات کے الم انگیز واقعات نے ان کی حقیقت پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ بازوؤں کو پوری طاقت سے سکیڑتا ہوا یکایک کانپنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے مرقع کو پاؤں لگ گئے ہوں اور تصویروں کے تمام کردار اپنے اپنے فرائض میں مصروف ہو گئے ہوں، اور وہ چلنے پھرنے لگی ہوں، دربار کی تصویر، اس میں بادشاہ بھی موجود ہے —— غلام، سپاہی، سفیر سب موہوم صورتوں میں یکے بعد دیگرے اسے نظر آئے، ان میں اس کے الجھنے کے لئے نئے نئے پہلو نکل آتے، اس نے ہر پہلو سے جو اس پر خوف طاری ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا تھا۔ فریب دینے اور اپنے بچاؤ کے لئے اپنی ذہانت سے پوری پوری کوشش کی، اس کے لب کھل گئے، اس نے سر کو نیچا کر لیا، کمر بوجھ کے مارے جھک گئی، وہ بازوؤں کو بے تابی کے ساتھ فرغل کے اندر حرکت دیتا۔ پھر رک جاتا، اور کپڑے کو گھبراہٹ کے ساتھ کانوں کے گرد تن لیتا —— یہ اضطراب، یہ پریشانی —— اسے اپنے قدم پیچھے کی طرف اُٹھتے محسوس ہوتے تھے، اندھیرے کی تہوں میں دھیمی دھیمی صداؤں میں سکوت کے تمام گھرے سائے میں ایک ہیجان پیدا ہوا، پھر یکایک شور و غل —— قہقہوں کی صدائیں، سپاہیوں کے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں، زنجیروں کی جھنکار اور مختلف الفاظ اس کے کانوں سے گذرے، ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی، سکوتِ شب

میں زندگی کی تمام علامتیں مفقود ہو چکی تھیں، قمر و بلل چکا تھا۔ وہ اور کا اور ہو گیا تھا۔ ہر ساعت کی تبدیلی بے چینی کا سامان بہم پہنچاتی تھی، وہ بہت بُری طرح اُلجھ گیا تھا۔ قریب تھا کہ چیخیں مارنے لگے، اور بھاگ نکلے۔ اس کے قدم پتھر سے سخت لوہے کی زنجیروں سے زیادہ بھاری معلوم دیتے تھے —— بڑا مضبوط انسان اپنے ذہن کی آوازوں میں گھر کر کمزور ہو گیا تھا! گھر کا دروازہ اس کی انتہائی آرزو تھی۔ اس کی آنکھیں دیکھنے کی بجائے سننے لگی تھیں، اس نے بے صبری سے اِدھر اُدھر دیکھا، —— اسے اِدھر اُدھر دیکھنے کی عادت ہو گئی تھی، اس کے آنسو اس کی پلکوں میں بے جان ہونے کی وجہ سے رُکے پڑے تھے، پھر ایک آواز روشنی کی طرح نمودار ہوئی، کسی نے کہا، شاہجہان نے تاج من کی موج، روح کی خوشی کے لئے بنایا تھا، محبت کی یاد، الفت کا اظہار جوں کا توں رہیگا۔ وہاں موت نے شکست کھائی ہے۔ آنے والی دنیا دیکھے گی، بڑے بڑے مبصر اور نقّاد اس کی داد دینگے۔ اس سے دنیا کے فنِ تعمیر میں اضافہ ہو گا۔ تو کیا میں مر جاؤنگا یہ مرقع کون لے جائیگا، مجھے اس سے کیا غرض، میں نے اسے حاصل کر لیا ہے! میں اس کا مالک ہوں، میں اسے دیکھونگا، او جی بھر کے دیکھونگا۔ آزادی سے دیکھونگا۔ اس نے اپنے حواس کو اس موقع پر درست پایا، وہ پہلے کی طرح پُر معنی بن گیا —— وہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ ہی پُر معنی بن جایا کرتا تھا۔ وہ مہیب خیالوں میں الجھا ہوا گھر کے قریب پہنچ گیا تھا —— اس نے اپنا فرغل کھول دیا، اور

مرقع بغل سے نکال کر ہاتھوں میں تھام لیا، فضا کو بد گمان نگاہوں سے دیکھتا ہوا اُلٹے سیدھے پاؤں جس طرح بھی اس سے بن پڑا، دروازہ تک پہنچ، قفل کھول نہایت اطمینان کے ساتھ بغیر ادھر اُدھر دیکھے اندر داخل ہو گیا۔ ان تمام چیزوں کو جو اس نے اپنے دیوان خانے میں جمع کر رکھی تھیں قدیم روایات کے ساتھ موجود پایا، ان کو دیکھ کر وہ دھرتی کے سینے پر دیوتاؤں کی طرح رقص کرنے لگتا تھا۔ وقت نے اس کے ارادوں میں ایک تسلسل قائم کر دیا تھا، اسے جرأت ہو گئی تھی، وہ بے تاب تھا کہ روشنی کرے، اور شمع دان کے سامنے بیٹھ کر مرقع کو جی بھر کر دیکھے۔

اندھیرے میں ایک شعاع کے بے تابانہ پھیلاؤ میں ایک سانس کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا، فضا عجیب و غریب شکلوں اور متحرک سایوں میں گھر گئی تھی، وہ چاہتا تو اپنا گلا گھونٹ لیتا، کیونکہ بڑے بڑے سیاہ دھبے اسے مختلف شکلوں میں تبدیل ہوتے دکھائی دیتے تھے، بعض دیواروں سے چمٹے ہوئے معلوم ہوتے، وہ دیوان خانہ کی چار دیواری کو پُراسرار نگاہوں سے گھورنے لگا۔ دیواریں! —— کیا یہ بالکل شکستہ ہیں؟ یہ اس کے اپنے الفاظ تھے۔ ان پر مختلف قسم کی اشیاء لٹک رہی تھیں، بعض حصوں میں ڈراؤنی شکلیں اور ایسے چہرے جو جھلسے ہوئے معلوم دیتے تھے، تمام عجائبات اور اس کی بنائی ہوئی جنت اس کی نظروں میں بھرنے لگ گئی۔ وہ بیٹھا ہوا تھا، شمع دان جل رہا تھا۔ مرقع اس کے سامنے

کھلا تھا ——— "یہ میری ملکیت ہے، میں اب اسے اطمینان سے دیکھوں گا۔" اس نے کہا پہلے یہ طاؤس جو سامنے دیوار پر لٹک رہا ہے جس کے تاروں سے راگ کی تمام قوتیں زائل ہو چکی تھیں، زمین پر رکھ دوں، یہ کیوں کانپ رہا ہے۔ یہ ایک بھیانک سائے کی طرح مجھے تکلیف دینے لگے گا۔ پھر اسے اس کے ٹوٹے ہوئے تار ہلتے ہوئے معلوم دیئے، پھر ایک راگ کی گونج کھوئی ہوئی سروں کی آواز کے ساتھ بالکل ایسی جو شکستہ مقبروں کی تہوں سے اُبھرے اور شاہی ایوانوں کی بلندیوں اور وسعتوں میں مل کر وحشت بن جائے، اس نے ٹوٹے ہوئے تاروں کے حرکات کی موزونیت کو دیکھا۔ اس کے خیالات پر محویت سی طاری ہوئی، پھر ایک اور سایہ اسے پہلے سے زیادہ صاف نظر آیا، اس کے سُرخ سُرخ لب حرکت کرتے مسکراتے معلوم دیئے، اس کی آنکھیں پٹی سے بندھی ہوئی تھیں،

قمرو تمام واقعات کے اندر مستقل مزاج بنا بیٹھا تھا۔ شمع دان شاہانہ تمکنت سے کھڑا سب کچھ دیکھتا ہوں کا توں پہلے کی طرح روشنی دیئے جا رہا تھا۔ دیوان خانہ آج کی رات کچھ اور کا اور نظر آ رہا تھا۔ ٹوٹے ہوئے تاروں کی حرکات سے کچھ ایسا نغمہ پیدا ہو رہا تھا کہ کوئی سُن لے تو کہے، دنیا کے تمام نغموں کا سرچشمہ یہی ہے۔ قمر زیادہ کانپنے لگ گیا تھا۔ وہ کہنے لگا ——— اگر تو اس ساز کی مالکہ ہے جو میں نے ایک مفلس سازندہ سے خریدا تھا تو اے سحر زدہ حسینہ تیرے بازو کیوں کٹے ہوئے نظر آتے ہیں، تیری آنکھیں اس بے رحمی سے کیوں بند

کردی گئی ہیں، یہ شمع دان جس کے سامنے میں اس عجز و نیاز سے محض سستانے کے لئے بیٹھ گیا ہوں، اے مغنیہ، اچھے خوبصورت، سرخ سرخ بالوں والی حسینہ افسوس تو دیکھ نہیں سکتی، یہ کس قدر شکل و صورت والا، کتنا جاہ و جلال والا شمعدان ہے، خدا جانے کتنے حسین ترین شاہزادے اور شاہزادیوں نے اس کے سامنے محبت کا اظہار کیا ہوگا، اور عہد و پیمان باندھے ہونگے، اے ساحرہ ——" وہ کچھ اور کہنا ہی چاہتا تھا، کہ ایک قہقہے کی آواز کے ساتھ وہ سایہ گم ہو گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی نظر راجہ نٹ کے بت پر جا پڑی، جو اس عجائب خانے کی زینت بنا ہوا تھا —— اس نے یہ بت بنارس کے ایک بوڑھے پنڈت سے خریدا تھا۔ پنڈت نے بیان کیا تھا۔ یہ دیوتا موت پر بھی قادر ہے —— اس نے دیکھا شکتی مان دیوتا خوشی رچا رہا ہے۔ وہ بوڑھا پنڈت اور اسی شکل و صورت کی ہزاروں لاشیں اس کے پاؤں کے نیچے روندھی جا رہی ہیں، اور وہ ان پر بڑی بے رحمی سے ناچ رہا تھا —— مرنے والوں کی ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں جب اس کے کانوں میں آئیں تو سہم کر دروازے کی طرف دیکھا —— وہ چاہتا تھا۔ کاش وہ کھلا ہوتا۔ اور میں بھاگ کر نکل جاتا —— اس نے کہا، یہ ایک نئی مصیبت ہے، میرا خیال بالکل غلط ثابت ہوا کہ دیوان خانے میں پہنچتے ہی مجھے کامل اطمینان ہو جائیگا۔

اس مہیب فضا میں قمرو، متردد تھا، وہ فریب زدہ مستقبل کی آہٹ سن

رہا تھا، ایک طوطا جس کو بنانے والے نے سفید بنایا تھا۔ قمرو کو اس سے بے حد محبت تھی، اس کی آنکھوں میں دو بڑے قیمتی سرخ لعل جڑے ہوئے تھے، اس فضا میں بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا، گویا اسفید چادر پر خون کے دھبے پڑ گئے۔ یہیں اس کی آنکھیں شعلوں کی طرح چمکنے لگیں، طوطے کی اس طوطا چشمی دیکھنے سے قمرو کے دل پر ایک ٹھیس لگی، جو اس کے صبر کو کھو گئی، اور اس کے درد کو ناقابلِ برداشت بنا دیا۔ اس نے اسے گردن سے پکڑا اور ایک بڑے مزملہ کے پیچھے چھپا دیا، جس پر کاشی کاری کا کام ایک بہت بڑے کوزہ گر نے انجام دیا تھا۔ کہتے ہیں شاہ عباس کا بڑا عزیز دربار کی زینت، رنگ آمیزی میں ماہر آب و گل پر قدرت رکھنے والا دیوتا عجم کی خاک نے پھر ایسا کبھی پیدا نہیں کیا —— اس پیالے پر اس نے بہرام گور کی تصویر بنائی تھی، جو ایک غزال پر بے دردی سے تیر چلا رہا ہے، یہ عجائبات جو قمرو نے اپنے عجائب خانہ میں جمع کر رکھی تھیں ان کے پیچھے قدیم تہذیب کی یاد اور گذشتہ عظمتیں زندہ جاوید چلتی پھرتی اسے بھیانک خوابوں کی طرح نظر آنے لگی تھیں —

اس کی نظر دوبارہ راجہ ہٹ کے بت پر جا پڑی، اس دفعہ اس کی گردن میں اسے سیاہ سانپ لہراتا ہوا نظر آیا، اب وہ اپنا پر وحشت ناچ ختم کر چکا تھا۔ وہ سستانے کے لئے بیٹھ گیا تھا۔ پھر اس نے ایک سایہ دیکھا جو اس کے اردگرد منڈلا رہا تھا۔

اس نے اپنی قبا کے بند کھول ڈالے، فرش اور دیواروں پر خون کے سیاہ دھبے چمکتے ہوئے معلوم دیتے، اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے کچھ دیکھ لیا تھا۔

مرقع کھلا ہوا تھا۔ اس پر شمعدان کی دھیمی دھیمی روشنی ضیا پاشی کر رہی تھی، کاغذ بالکل سفید دکھائی دیتے تھے —— اس نے کہا، نقوش کیوں دکھائی نہیں دیتے، یہ کاغذوں کا مجموعہ کسی مصری جادوگر کا کمال ہے —— یہ قہقہہ کی آواز کیسی ہے شاید موت مجھ پر ہنس رہی ہے، وہ مرقع آنکھوں کے قریب لایا۔ اس کی نظریں چندھیا گئی تھیں، اسے کچھ دکھائی نہ دیا، اس نے مڑ کر دیکھا —— وہ اس کا عادی ہو چکا تھا قفل ضرور لگا ہوا ہے، کون ہوگا —— مجھے کون مجرم قرار دیگا، نہیں کوئی نہیں سپاہی ہونگے، وہ مجھے ہتھکڑیاں پہنا دیں گے —— دیوانہ فرزانہ بن گیا تھا۔ ذرا تن کر کہنے لگا —— بس بس صرف اس قدر، نہیں وہ مجھے موت کی دھمکی دینگے اور اپنے تیز تیز آہنی نیزے میرے بدن میں گھونپ دینگے، شاید ایسا ہی ہو، دروازہ یقیناً بند ہے، کیا معلوم کھلا رہ گیا ہو؟ کیونکہ میں نہایت پریشانی کی حالت میں اندر داخل ہوا تھا —— کچھ ہو، کوئی آجائے، میں یہ شمعدان گل کر دوں گا، جو صدیاں ہوئیں شہنشاہوں کی محفل میں بڑے وقار سے روشنی کرتا چلا آیا ہے۔ اے پروقار شمع، اے روشن چراغ، تجھے بادشاہوں کی قسم تو نے شہنشاہوں کو دیکھا ہے۔ تو نے قمرو کو بھی دیکھا ہے۔ کہتے ہیں تیرا ذکر جہانگیر جیسے بادشاہ نے اپنی توزک میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے، تاتاریوں نے ایک مشہور چینی صناع سے بنوا کر تجھے حسین مرزا کی نذر گزارا تھا۔ اے شمعدان تو میرا ہے میں تجھے گل کر دونگا —— اور اس مرقع کو آغوش میں لے کر اس ماں کی طرح جو نوزائیدہ بچے کو لے کر سو جاتی ہے، اس متحرک

جگہ پر اس مسافر کی طرح سو جاؤں گا جس کا اس دنیا میں کوئی نہ ہو اس کا دل بھر آیا، اس کے آنسو پلکوں سے آہستہ آہستہ گرنے شروع ہوئے، اس کے ہاتھ مرقع پر بڑی مضبوطی سے رکھے ہوئے تھے ——— میرا جرم صرف اس قدر ہے کہ میں نے اسے کھنڈروں میں سے حاصل کیا ہے، یہ وہاں ان کے آباد کرنے والوں کی آخری یادگار تھا ——— اس کا سایہ لرز رہا تھا، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ——— وہ مرقع پر بے جان بُت کی طرح جھک گیا ——— یہ میرا ہے ——— اس کو کوئی ——— مجھ سے ——— !

تمام فضا دیکھتے دیکھتے بدل گئی، ایک سانس، صرف ایک سانس ——— پرچھائیں کی صورت خزاں کے پتّے کی مانند فرش پر رینگتا ہوا محسوس ہوا ——— دیوان خانہ میں کامل سکوت تھا، کوئی جنبش نہ تھی، شمعدان مصداق جُوں کا تُوں وقار کے ساتھ کھڑا ہوا سب کچھ دیکھتا جل رہا تھا۔

کہتے ہیں وہ مرقع مع ان مٹے ہُوئے نقوش اور اس صفحے کے، جس پر قمرو کے آنسوؤں کے نشان موجود ہیں کسی گمنام عجائب خانہ کی زینت ہے اور قمرو کی یاد اب صرف اسی قدر باقی رہ گئی ہے !

۱

تاجدار

سینا کا سب سے بڑا شہر بعلصورا، جہاں عرم قوم کو حکومت کرتے صدیاں گذر گئی تھیں تجلیوں کا گہوارہ تھا۔ بعلصورا کو قوم عرم نے بسایا تھا، وہ اس کی رونق تھے، اور وہ ان کا فخر تھا، ابن حسام نے جو قوم عرم کا سب سے پہلا بادشاہ تھا اس کی بنیاد رکھی تھی، اور حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ اس نے اپنی قوم کے لئے چھوڑا، اُس کی بہترین یادگار بعلصورا تھا۔ بعلصورا کے رہنے والے زندگی کی حقیقی لذتوں سے آشنا تھے، ان کے نزدیک زندگی عمل کا دوسرا نام تھا۔ انہوں نے زندگی کو معراج کمال تک پہنچانے کے لئے ان گنت قربانیاں کی تھیں، وہ دل رکھتے تھے۔ انسانوں کا سا دل!——

کون کہہ سکتا ہے انہیں زندگی کا معیار قائم کرنے میں کتنی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔

مورخین کا بیان ہے۔ کہ انہوں نے قوم اسرائیل کو جب وہ انتہائی مصیبتوں میں سے گذر رہی تھی، اپنے ملک میں پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا، اور فقط اس لئے انکار کر دیا تھا۔ کہ بنی اسرائیل کی حد سے بڑھتی ہوئی غلامانہ ذہنیت میں وہ اپنے مستقبل کے لئے ایک خطرہ عظیم دیکھتے تھے!

کہتے ہیں قوم عرم کا سب سے بڑا بادشاہ، بادشاہ نعمان، بادشاہ کے بھیس میں خدا کا پیغام تھا۔ نعمان بادشاہ تھا، اس کا دل بادشاہوں کا دل تھا اور سانپ کی طرح جب تک اس پر پاؤں نہ پڑے وہ کسی کو ڈستا نہ تھا۔ نعمان کی عظمت اور جبروت کی تاریخ شاہد ہے، آج تک اس کا ملک اور اس کی قوم اس کے بنائے ہوئے قانون اور روایات کو دنیا احترام سے بھرے ہوئے دل اور نیاز سے جھکی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ وہ ایک صحیح قسم کا بادشاہ، صرف بادشاہ تھا۔

احسن بن عاصم لعلصور اکا سب سے بڑا مورخ لکھتا ہے۔ کہ جب وہ تخت پر بیٹھا تو صحرا کی فضا میں ایک روشنی نمودار ہوئی اور ماؤں نے اس نیک ساعت کی یاد میں اپنے بچوں کے بازوؤں پر تعویذ باندھے۔ اس کا بیان ہے کہ جب نعمان تخت پر رونق افروز ہوتا تھا تو اس کی کشادہ پیشانی پر تجلیاں نمودار ہوتی تھیں، اور اس کے سرخ لبوں پر ایک مسرت آمیز تبسم موج حیات بن کر دوڑ جاتا۔ اس کی آنکھیں جہاں کی آئینہ دار تھیں، اور وہ خود انسان کا مستقبل نظر آتا تھا۔ نعمان سے کبھی کوئی لغزش نہ ہوئی تھی، اس کے ہاں اولاد کی کمی نہ تھی، بچوں کی تربیت کا اسے غیر معمولی

ذوق عطا ہوا تھا۔ خصوصیت سے اس کے عہد میں عورتوں نے علم و ادب کا اکتساب مردوں کے دوش بدوش کیا تھا۔ اس کا سبب اس کی لڑکیاں تھیں۔

نعمان نے برسوں کی سوچ بچار کے بعد اپنے رہنے کے لئے ایک محل تیار کرایا تھا۔ فنِ تعمیر کا نمونہ، آہستہ آہستہ مشرق و مغرب میں آپ اپنی مثال بن کر رہ گیا۔ اس کے بڑے بڑے ستون نیلگوں گنبد اٹھائے ستاروں بھری رات میں یوں دکھائی دیتے گویا صحرا نادیاں محملوں کے نیچے، کھجوروں کے جھنڈ میں سے گذر رہی ہیں۔ یہ محل جس میں نعمان رہا کرتا تھا، بعلصورا کی پیشانی پر، اس طرح روشن تھا، جیسے زمانِ شاہی پر مہر ثبت کر دی گئی ہو۔ صدیوں کی روایات اس کے پیچھے رحمتِ حق کی طرح پر کھولے کھڑی تھیں ——— انجام کار یہ محل جسے نعمان نے اپنی ذات کے لئے بنایا تھا۔ مظلوموں کی داد رسی کے لئے وقف ہو گیا۔

وہ شان اور جاہ و جلال جو قوم عرم کی پر وقار زندگی کا ثبوت تھا اور جس کا بنیادی پتھر ابنِ حسام کی وسعت نظری نے رکھا تھا، قوم عرم کی قدیم روایات بعلصورا کے وارثوں میں اب بھی موجود تھیں لیکن رفتہ رفتہ زمانۂ گذشتہ کی یاد ایک قدیم سکّے کی طرح زنگ آلود ہو رہی تھی کوئی نہ کہہ سکتا تھا "آیا یہ تغیر" محض بزرگ اور برگذیدہ ہستیوں کے چلے جانے کی وجہ سے ہے "یا قوم کے انحطاط کے نشان ہیں؟

نعمان کا محل صوفیا سے دور تھا اور لیفٹینٹ کی جانب سے کچھ اس طرح پہاڑوں کے دامن اور چوٹیوں سے ملا دیا گیا تھا، کہ آج تک کسی نے اس کی صحیح وسعت

کا اندازہ نہیں لگایا۔

صوفیا ——— طوبا کے صحراؤں میں مصر کے دیوتا ابوالہول کی طرح کھڑا توم عرم کی تہذیب کا زندہ معجزہ کہلاتا تھا۔ بعلصورا کے اندر بادشاہ آتے اور گئے، مگر وہ نقشہ جو نعمان نے اختراع کیا تھا، ویسے کا ویسا موجود تھا۔ اس میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ دو پہرہ دار ستونوں کی طرح مضبوط، سرخ آنکھوں والے ہاتھوں میں آہنی بلم لیے دن رات صوفیا کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ محل کی بلندی میرِ عمارت کے کمال سے بادشاہ نعمان کی شبیہ معلوم ہوتی تھی، اس کے گرد زرد، سرخ کھجوروں کے جھنڈ اس طرح نظر آتے تھے گویا بڑھاپے کے غصے میں کسی کے بال اِدھر اُدھر بکھر گئے ہیں۔

صوفیا، کوہ اوفا کے دامن میں ایستادہ لالہ صحرا کی طرح خودستائی کی داستان کہہ رہا تھا۔ اس کے وارث نہ جانتے تھے کہ اس نے کیا کیا دیکھا ہے۔ انسانی نظریں بلندی کی جانب اٹھتیں، تو تذبذب لیے ہارا کرتیں۔ صوفیا کی تعمیر میں بادشاہوں کی دولت عقل کا سرمایہ، محبت اور عقیدت سب کچھ استعمال ہوا ہے، صوفیا درحقیقت ایک چھوٹے سے صحن کا نام تھا جو سفید سنگِ مرمر سے تیار کیا گیا تھا۔ قربلا کے بڑے بڑے صناعوں نے اس کی چھت، اور دیواروں پر شیشے اور کانچ کا کام کچھ اس طرح کیا تھا، کہ بادشاہ آنے جانے والوں کو ہر زاویۂ نگاہ سے دیکھ سکتا تھا۔ جمع جو اس وقت کا سب سے بڑا صناع تھا۔ اس نے بادشاہ کی نشست تیار کی تھی جس پر

اُس کا نام کندہ تھا۔ ایک مورّخ لکھتا ہے۔ صوفیا نعمان کا سب سے بڑا بیٹیا تھا جو اس کی زندگی میں مر گیا تھا۔ وہ ایک ہسپانوی شہزادی کے بطن سے تھا۔ جب یہ صحن تیار ہوچکا تو نعمان کو اس میں ایک کھوئی ہوئی خوشی چلتی پھرتی نظر آئی۔ اس نے اپنے بیٹے کی یاد میں اسی کے نام سے منسوب کر دیا۔

محل کے باہر دو دراز قد پہرہ دار جو حکومت کا وقار اور اس کے شکوہ کا ثبوت تھے، بالکل چپ چاپ کھڑے رہتے تھے، ان کی خاموشی میں ہزاروں پُر معنی الفاظ کی فصاحت تھی، وہ ایک ہی نظر میں بہت کچھ کہہ جاتے، جب کوئی ان کے سامنے سے گذرتا تو ان کے آہنی بلم کچھ اس طرح جیسے وہ بخود ان کے سامنے آکر رُک گئے ہوں، رک جاتے، وہ چلتے چلتے ٹھہر جاتے، ان کے سر جھک جاتے۔ ایک نوبت بجتی اور بادشاہ معہ اپنے مصاحبوں کے کاروان انجم کی طرح محل میں داخل ہو جاتا۔ بعلصورا کے رہنے والے یہ سب کچھ جانتے تھے کیونکہ یہ رسوم صدیوں سے چلی آتی تھیں۔

ایک شب بعلصورا بھولے بھٹکے خوابوں کی یاد میں محو تھا لیکن صوفیا کے اندر ایک بزم طرب جو بادشاہوں کے شایانِ شان تھی جمی ہوئی تھی۔ نعمان کے اپنی راہ سے بھٹکے ہوئے وارث وقت اور زندگی کا لطف لے رہے تھے۔ اس وقت صوفیا سے دور دور تک کوئی آہٹ اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی صحن کے باہر دروازوں پر دھیمی دھیمی روشنیاں نیند کی غنودگی میں اونگھتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں

پہرہ دار سامنے دائیں بائیں اور پیچھے نظریں جما کے دیکھ رہے تھے۔ معاً وہ اس ہرن کی طرح ہشیار ہو گئے جو گھنے جنگل میں کسی آنے والے خطرے کی آہٹ سنتا ہے ساتھ ہی ساتھ وہ چیتے کی طرح مستعد اور حملہ کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے ایک سایہ دیکھا جو اس رات کی تاریکی میں کالے بادلوں کی سرعت اور نسیم کی خاموشی کے ساتھ بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ انہوں نے اپنے آہنی بلموں کو حرکت دی لیکن اس سے پیشتر کہ وہ اپنے شکار پر جھپٹتے، سایہ رُک گیا!

ایک آواز آئی "بادشاہ کہاں ہے، مجھے بادشاہ سے ملنا ہے"۔

پہرہ دار ٹھٹھک کر رہ گئے، نوجوان پہرہ دار نے تمکنت سے کہا۔ دروازہ بند ہو چکا ہے، اور بادشاہ آرام میں ہے"۔ لیکن آنے والے نے نوجوان سردار کی ایک نہ سنی اور کہا۔ "مجھے بادشاہ سے ملنا ہے، نعمان ابن حسّام کا وارث کہاں ہے"؟

پہرہ داروں نے اپنے بلموں کو زمین پر زور سے مارا۔ اور کہا۔ یہ وقت بادشاہ ہُول کے آرام کا وقت ہے، پرانے قانون تبدیل کر دیئے گئے ہیں، نعمان اور ابن حسام کا وارث آرام کر رہا ہے۔ اور اس کے آرام میں کسی فریادی کی آواز خلل انداز نہیں ہو سکتی، تو عورت ہے، اس لیے تجھے اس سزا سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ ورنہ ——"

"لیکن" عورت نے کہا "میں ابن حسام کے وارث سے ملنا چاہتی ہوں۔ میں سخاوت نہیں چاہتی، میں فریاد نہیں لائی، میں قوم عرم کے بادشاہ سے ملنا چاہتی ہوں"۔

پھر اس نے بوڑھے سردار کو مخاطب کر کے کہا۔" اے سردار میں تیرے بادشاہ سے ملنا چاہتی ہوں"۔ یہ الفاظ اس نے کچھ اس طرح سے کہے کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اس نے بوڑھے سردار کے بلم کو پکڑ لیا اور کہا" اے سردار تو دانشمند ہے، تیرا ساتھی نوجوان ہے، تو نے عمر کی بہت سی منزلیں دیکھی ہیں، میں کسی کے جذبات پر غلبہ حاصل کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے کچھ مانگنا نہیں، وہ بادشاہ ہے۔ میں اس کی رعیت ہوں، اے سردار میں اپنے بادشاہ سے ملنا چاہتی ہوں"۔

بوڑھے سردار نے بلم کو زمین پر ٹیک دیا۔ نگاہیں دور ہواہیں پیوست کر دیں۔ گویا اپنی گذشتہ زندگی کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر شاہین کی طرح جو بلند فضاؤں میں اُڑ رہا ہو عورت کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں، آخر اس نے اپنا دایاں ہاتھ جو غالباً کانپ رہا تھا۔ اس کے سر پر رکھ دیا، شاید وہ ایسا کرنا نہ چاہتا تھا، اس کے فرائض اسے اجازت نہ دیتے تھے مگر جذبات کی شدت نے اس پر غلبہ حاصل کر لیا اور وہ بولا۔" تیری آرزو میں موت کی مسکراہٹ اور تیرے جذبات میں زندگی کی جھلک نمایاں ہے۔ آ ہم بادشاہ کے حضور میں چلتے ہیں میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں موت میرا انتظار کر رہی ہے۔ آ۔ اے جذبات کی دنیا میں رہنے والی، آ ایوان شاہی کو یہ راستہ جاتا ہے"۔

سردار سینے پر ہاتھ رکھے بادشاہ کے حضور میں کھڑا تھا۔ وہ زمین تک جھک گیا اس کی آنکھیں بند تھیں اس کی زبان پر مہر لگ گئی۔

بادشاہ نے سردار کی طرف بادشاہوں کی سی خشمناک نگاہ سے دیکھا۔ پھر اس کے ساتھی پر نگاہیں گاڑ دیں، عورت سینے پر ہاتھ رکھے زمین تک جھک گئی۔ آداب محفل، شاہی احترام، وہ سب کچھ جانتی تھی۔

اس نے کہا۔" اے بادشاہ۔ یہ بازو ابھی تک تیرے بچپن کی مسرتوں سے سرشار اور تیری محبت سے لرزاں ہیں! اے بعلصورا کی قسمت کے مالک، میں نے کئی برس اس چھت کے نیچے گذارے ہیں، یہاں کا ذرہ ذرہ میری آواز سے آشنا ہے۔ اے بادشاہ تو نہیں جانتا۔ ان ایوانوں میں کیا کچھ ہوچکا ہے، اور کیسے کیسے باکمال صناعوں نے اہل نظر سے اپنے کمال کی داد حاصل کی ہے۔ یہ جگہ بادشاہوں کی جگہ ہے۔ جہاں زندگی اپنے مدارج پہچانتی ہے اور نکتہ چین نگاہیں حق کا اظہار کرنے میں ذرا بھی نہیں جھجکتیں، میں نے بھی ان لازوال مسرتوں میں اپنی زندگی کے بہت سے دن گذارے ہیں، اے بادشاہ تو دیکھتا ہے، میری آواز تیرے محل کے کونے کونے میں سماگئی ہے۔ تیرے محل کے گنبدوں اور محرابوں نے میری آواز کو دل کے اندر جذب کرلیا ہے۔ اے بادشاہ تو بھی تو کھویا سا گیا ہے۔"

بوڑھے سردار نے اطمینان کا ایک سانس لیا۔ اس کی جرأت نے کروٹ لی۔ وہ عجز سے جھک گیا اور اس نے پہلے کی طرح پھر ایک بار عورت کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کے لبوں پر کسی قسم کے جذبات کی جھلک نمایاں نہ تھی۔ نو وارد عورت نے دنیا بدل دی تھی، بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے بادشاہت کا نیا باب کھل

گیا۔ اس کی گردن جھک گئی، اسے ماضی اور مستقبل دونوں کے درمیان جہاں مجاہدوں کے قدم آچکے تھے یا آنے والے تھے، ایک مضبوط دیوار حائل نظر آئی۔ طرح طرح کے خیالوں نے اسے جھنجھوڑا مگر عورت نے سلسلۂ کلام جاری رکھا اور کہا۔

"میں دربار کی مطربہ ہوں، میں مغنیہ ہوں، میں محسوس کرتی ہوں کہ میں ابن حسام کے وارثوں میں بیٹھی اپنا بربط زانوؤں پر رکھے، نغموں کا تموج، الہامی روشنیوں کی طرح مشرق و مغرب کی بیداری کے لئے نچھاور کر رہی ہوں"۔

مدھم مدھم روشنیاں جو صحن کے اندر باہر اُجالا کئے ہوئے تھیں، دیکھتے دیکھتے دھندلی پڑ گئیں، تھکا ہارا بادشاہ بدن ڈھیلا چھوڑے جیسے کوئی سن رہا ہو، عورت کا چہرہ تک رہا تھا۔ لذتوں کی اشتہا پیدا کرنے والی ہر شئے قرینے سے چُنی ہوئی تھی، بینا میں رنگین لباس پہنے، فانوسوں کے نیچے خواہشوں کی طرح گویا سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ بادشاہ کی شکل و صورت نے مطربہ کے ذہن پر کوئی ایسی کیفیت پیدا نہ کی جس سے وہ اپنی پہلی آزادی کھو بیٹھتی، کرب کی وہ کیفیت جس سے انسان جنون کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ مغنیہ اس کیفیت میں کھڑی تھی، اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس میں ابھی تک سحر کی طاقت موجود ہے اور جس طرح پہلے بڑی بڑی شخصیتوں کو اس نے وقت کی بساط پر مات دی تھی اب بھی دے سکتی ہے۔!

عورت کے پیش نظر صرف ایک پیغام تھا، وہ چاہتی تھی۔ کہ پیغام کی ایک تصویر بن جائے۔ تاکہ بادشاہ رنگوں اور خطوں کی خوبصورتی میں انتہا پیدا کر سکے، وہ دیکھ

لمحہ چُپ رہی اور دھیمی آواز میں بولی "۔ اہلِ کمال کو شاہوں کے قرب کی سخت ضرورت ہوتی ہے"۔

وہ بے تاب تھی، شاید وہ کہنا چاہتی تھی کہ شہر یار بھی اہلِ کمال کے محتاج ہیں، اس کی آنکھیں گذری ہوئی یاد سے مخمور تھیں، بادشاہ بُت بنا بیٹھا تھا۔ گویا اس میں احساس کا نشان تک نہ تھا، اس میں اس بات کے اظہار کی بھی طاقت نہ تھی، کہ یہ وقت اس کے آرام کا وقت ہے۔ مطربہ نے کسی بہت بڑے جذبہ کی یاد میں اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک دیئے اور آنکھیں بادشاہ پر جما دیں، وہ سمجھ رہی تھی کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتی ہے اگر کہہ سکی تو اس کا مقصد اسے حاصل ہو جائیگا۔

وہ بولی "اے بادشاہ بخشش کا اظہار شخصیتوں پر ہے۔ حکومتوں کی دولت مزدور کا سرمایہ ہے۔ وہ اسی لئے دنیا کی ہر مادی شے پر قادر ہے، تو خوش ہو کہ دنیا تیری ضیا سے روشن ہے، وہ تیرے خوش ہونے سے خوش ہے لیکن اے بادشاہ کسی کو شریک غم نہ بنا، کیونکہ غم اور فکر نعمت ہیں، جو انسان کو پختہ تر بنا دیتے ہیں، میں ایک مطربہ ہوں، میں نے سوز و ساز کی تصویریں کھینچی ہیں، میں نے ان میں رنگ بھرے ہیں اور جب چاہا اور جس طرح چاہا ان کو بدل دیا ہے، میں نے دنیا کو ایک سرمدی سرور بخشنا تھا، میں مطمئن ہوں میں نے جو کچھ کیا بڑی دیانت داری سے کیا۔ اے بادشاہ میں ایک بہت بڑی طاقت ہوں۔ میں نے بڑے بڑے حکمرانوں اور بادکمالوں کو اُن آنکھوں کے سامنے اور کا اور ہوتے دیکھا ہے۔ ایک آرزو جو

محبت کی صورت اختیار کر لیتی ہے کسی کی محکوم نہیں یہاں تک کہ جس کے اندر وہ پیدا ہوتی ہے۔ اس پر بھی حکومت کرنے لگتی ہے۔ اے بادشاہ تو جانتا ہے، محبت نے جنت کا راز بھی افشا کر دیا تھا۔ محبت کا حسین ترین لباس آنسو ہیں اور آنسو عورت کا شیوہ، تو یقین جان کہ عورت ہی محبت کرنا جانتی ہے۔ اے بادشاہ میں نے بھی محبت کی ہے اور اپنے آپ کو کسی طاقت کے سامنے لرزتے اور بے دست و پا ہوتے دیکھا ہے۔ صفیا، ملک کا بہترین سپاہی، بعلصورا کی محفلوں کی رونق، یہاں کا ذرّہ ذرّہ اس کی محبت کا دم بھرتا ہے، میری حیات و ممات اس کی خوشنودی پر موقوف تھی۔

بعلصورا کی تہذیب نے جب دنیا بھر کو اپنے اثر میں لے لیا، اور اس کے اخلاق اور ثروت نے دلوں پر تسلّط کر لیا، تو کچھ ایسے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے جن کی پیشانی کے خط، بعلصورا کی عالمگیر شہرت نے بدل ڈالے تھے۔ ان دنوں بعلصورا کی یہ حالت تھی، کہ بوڑھے سینے ابھارے گردنیں اُٹھائے جوانوں کی طرح سیدھے چلتے تھے، اور نوجوان بوڑھوں کی طرح نشاط اور گوناگوں لذتوں سے سرشار لڑکھڑاتے نظر آتے تھے۔ اے بادشاہ تو ان کا وارث ہے، لیکن وہ تجھ سے بہت مختلف تھے۔ تیرے اوصاف تیرے ہی ہیں، تو خیرات دینا جانتا ہے، مگر خیرات لینے والوں کے احساس سے ذرا واقف نہیں، وہ تخلیق اور تکمیل کے ماہر تھے۔ ہم ان کی نقل کرنا بھی بھول گئے ہیں۔ میں غنی ہوں اور میرا دل ایک غیر معمولی دل ہے۔ وہ دو لت

جو مجھے قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی میں نے شاہ و گدا پر نچھاور کر دی ہے۔

—— اے بادشاہ مجھے کیا کہنا تھا اور میں کیا کہہ رہی ہوں۔ میں یہ کہنا چاہتی تھی۔ کہ میں اپنی دولت لٹا چکی ہوں، میں مفلس ہوں، میں پھر ایک بار بادشاہ نعمان کے صحن میں بیٹھی نظر آ رہی ہوں اور اس لئے آئی ہوں کہ گذشتہ یاد کو تازہ کروں اور ان لمحوں کی طاقت پھر اپنے دل کے اندر محسوس کروں۔ جب ہمارے بوڑھے بادشاہ یعنی تیرے پیش رو کے خون نے جسم میں جوش مار کر جذبات کو مشتعل کیا تھا اور کس طرح میں نے سپاہیوں کے دلوں میں الفاظ اور آواز کے طلسم سے حیات اور اس کے مقصد کو جو کبھی فنا نہیں ہوتا، بجلی کی طرح بھر دیا تھا۔ یہاں کا ذرہ ذرہ میرا دیکھا ہے، وہ مجھے جانتا ہے اور میرا ممنونِ احسان ہے —— اے بادشاہ جب اطلصورا کے دشمن نے بوڑھے بادشاہ کی اُمیدوں کو غم و غصہ سے بدل دیا۔ تو میرے نغموں نے ان نغموں نے جو صحرا نوردوں نے اپنی جستجو کو زندہ رکھنے کے لئے بنائے تھے بوڑھے بادشاہ کو جواں سال بنا دیا۔ اے بادشاہ میں دیوانی نہیں، میں عقل سلیم رکھتی ہوں میں اپنے حقوق کی پامالی کا ذکر کرنے نہیں آئی۔ میں ان اوصاف کا ذکر کرنے آئی ہوں جن پر اطلصورا کے بسانے والوں کی زندگی کا انحصار تھا۔ مجھے تو قدرت یہی کہنا ہے کہ میں مطربہ ہوں اور اے بادشاہ تو بادشاہ ہے، موسیقی میری آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت ظاہر نہ ہوگی۔ مجھ میں اب کچھ باقی نہیں، میرے نغمے میرے ساتھ نہیں لیکن یاد رکھ میں اطلصورا کی مٹی سے بنائی گئی ہوں اگر جذبات کا اظہار انسان

کی تصویر ہے، تو میں وہ تصویر ہوں —— کاش میری زبان کچھ کہہ سکے اور میں کہوں کہ ضحا ایک بہت بڑا مجاہد تھا۔ اس نے اپنی بہادری سے ملک کے دشمنوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ خاموشی اس کی عادت تھی لیکن اس کے عمل اُس کی طاقت تھے۔ جب اس نے دیکھا کہ بوڑھا بادشاہ رحمتوں کا سرچشمہ دشمنوں کی یورش محسوس کرتا ہے، تو اس نے اپنے آپ کو پیش کیا اور بادشاہ سے کہا —— اے بعلبعورا کی قسمت کے مالک اس جنگ میں دشمن ذلیل ہونگے اور پھر ان کی نسلوں میں سے کوئی اس طرف آنے کا نام تک بھی لیگا۔ میں اور میرے ملک کے سارے نوجوان تیرے قدموں پر نثار ہیں!

بوڑھے بادشاہ کا دل بھر آیا۔ اس نے اس کی سلامتی کی دعا کی اور ان کی خدمات اور عقیدت کا اعتراف کیا —— اور کہا اے میرے بچو میں نعمان کا وارث ہوں میں بادشاہت کے فرائض کو پہچانتا ہوں۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ تم سپاہی ہو، میں بھی ایک سپاہی ہوں —— بادشاہ کا دل جوانی کی امنگوں سے شاہی وراثت کی ذمہ داریوں کی طرف کشاں کشاں جا رہا تھا۔ اس نے نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہا، میرے بالوں کی سفیدی میرے اندرونی جذبات پر پردہ ڈالنے کی انتہائی کوشش کر رہی ہے مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ بادشاہ کے الفاظ قدرت کا فیصلہ ہوتے ہیں۔ یاد رکھو، فاتح اور غالب قوموں کے خلاف ہمیشہ نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے، مفتوح اور مغلوب قوموں کا شیوہ ہے کہ وہ زندہ قوموں کی بہادری اور احسانات کو اپنے کمزور اور دریدہ دامنوں سے چھپانے کی کوشش کریں۔ نتیجہ

اور قوموں کو بنانے کے لئے محض دماغی نشو ونما ضروری نہیں، یہاں بسا اوقات دماغی توازن شکست کے مترادف ہوتا ہے، اس نے بہت سی لڑائیوں کا ذکر کیا جن میں ایک سپاہی کی حیثیت سے لڑا تھا۔ اس نے کہا میدانِ جنگ بادشاہ کا طالب ہے وہ میدان جنگ نہیں جہاں بادشاہ اپنے جانثاروں کے دوش بدوش نہ لڑے — اس نے حارث ابن احمر کا ذکر کیا جس نے اپنی قوم کو جنگ اور دشمنوں پر فتح حاصل کرنے کا سبق دیا تھا اور جس نے جان بوجھ کر اپنے سپاہیوں کو خطرات میں ڈال کر خطرات سے بچنے کا طریقہ سکھا دیا۔ اس نے ابن حسامؒ کا ذکر کیا جس نے اس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کے احکام پڑھ کر سنائے، اس نے کچھ اس طرح بادشاہوں اور مجاہدوں کے پیغام کی ترجمانی کی کہ دربار میں سب پر ایک سکتے کا عالم طاری تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ تہذیب نے ہمیشہ جہالت پر فتح حاصل کی ہے تم اپنے اصول سے ہرگز ہرگز متجاوز نہ کرو، کیونکہ انسانوں کی موت یہی ایک سیاہ وجہ ہے پھر اس نے صفیؔ اور اس کے نوجوان کو مخاطب کیا اور کہا۔ گو تمہارا بادشاہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ خطرات میں گھرا ہے مگر یاد رکھو وہ ابھی زندہ ہے وہ ایک بادشاہ کا وارث ہے، وہ جنگ میں جائیگا اور ان لوگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا جو اس کی زندگی اور دنیا میں خطرہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، وہ ان سے انتقام لینے کی کوشش کریگا۔ جنہوں نے اس کے بچوں اور ان بچوں کی ماؤں کے خون کو ارزاں کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ تم دیکھو گے، جام شہادت ایک بوڑھے انسان کے لئے

کس قدر خوشگوار شے ہے جہانگیری و جہاں داری زندگی سے نہیں نام سے ہے۔ مسند پر بیٹھے ہوئے بوڑھے بادشاہ کو تمہارے پیغام کا انتظار زندہ در گور کر دیگا —— ہم سب جنگ کو چلیں گے، جب میں تم جیسے وفاداروں کی گود میں لڑتے لڑتے دم توڑ دوں گا۔ اس وقت میرا چہرہ لافانی نور کی روشنی سے چمک رہا ہو گا۔

"پھر اے بادشاہ اس مسند سے جہاں تو بیٹھا سستا رہا ہے۔ ہمارا بوڑھا بادشاہ ایک جفاکش سپاہی کی طرح اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے سپاہیوں کے ساتھ جنگ پر جانے کے لئے تیار ہو گیا، بادشاہ نے کہا —— ہم کو زندگی کے ان مراحل سے گذرنا ہے اور ان حوادث کا مقابلہ کرنا ہے، جو ملک کو پہلے پیش نہ آئے تھے، پھر اس نے مجھ سے ایک گانا گانے کی فرمائش کی۔ میں نے ابوسعید کی ایک نظم پڑھی، مجھے یاد ہے میں نے نظم کا ایک ایک شعر کتنی بار دہرایا تھا خصوصیت سے یہ بول —— "جاؤ جاؤ —— سدھارو فتوحات تمہارا انتظار کر رہی ہیں" —— یہاں تک کہ بربط میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ یقین جان اے بادشاہ، تمام لعلصورا ایک زبان ہو کر کہہ رہا تھا —— جاؤ سدھارو، فتوحات تمہارا انتظار کر رہی ہیں!"

"بادشاہ نے کہا، میری تلوار لاؤ، جو آج حق کی حمایت کے لئے کمر میں آویزاں کی جائیگی جس کو امانت کے طور پر میرے آباؤ اجداد نے مجھے سونپا تھا۔ بادشاہ کا چہرہ نور کی طرح روشن تھا۔ اس نے کہا، میں اپنا تاج اس وقت نہ پہنونگا، جب تک وہ بالکل محفوظ نہ ہو جائے، اس کی آنکھوں میں استقلال اور مستقبل کی جھلک نمایاں تھی

پھر وہ تخت سے نیچے اُتر آیا۔ اور کہا۔ یہ تخت فاتحوں کے لئے ہے۔ اس پر وہ بیٹھ سکتا ہے جو فتح یاب ہو۔ اس کا جسم جذبات کی شدت کی وجہ سے الہام کی نازک ساعتوں کی طرح سکڑ گیا۔ وہ لرز رہا تھا۔ انسانوں کا یہ عالم تھا کہ ہماری پُرنم آنکھوں کے سامنے ایک بحرِ بیکراں موجیں مار رہا تھا۔ پھر بادشاہ نے سب کو مخاطب کر کے کہا ——— ہم اپنی تلواروں کو حق کی راہ میں استعمال کرینگے۔ ہم اپنے بچوں اور عورتوں کی حفاظت کرینگے۔ ہم قوانینِ قدرت کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں ——— نغموں کا تموج اور ساحرانہ نگاہیں، بیقرار روحوں کے درمیان لرز رہی تھیں، صوفیا کے نقش و نگار فانوسوں کی رنگ برنگ روشنیوں سے جگمگا رہے تھے۔ ایوان میں جوش کی لہریں بلند ہو رہی تھیں گلاب پاشوں کی جھنکار، جلترنگ کی ہم آہنگی پیدا کر رہی تھی۔ بچے اور بڑی بوڑھی عورتیں اوڑھنیاں ہلا ہلا کر اپنے ناموس کی حفاظت کا نشان بلند کر رہی تھیں ——— بادشاہ نے کہا، ہماری عورتیں، سپاہیوں کی عورتیں ہیں، سپاہی جنگ پر جائیں گے۔ عورتیں ملک کی حفاظت کرینگی۔ پھر ہر مجاہد کمر میں تلوار لگا کر باری باری اپنے بادشاہ کے سامنے سے گذرا اور آخر کار، آہ میں کیسے بتاؤں، کہ کس طرح بوڑھا بادشاہ ایک سپاہی کی حیثیت سے لعلصورا کی وادیوں میں سے گذرا۔ اے بادشاہ اس سے پہلے لعلصورا نے کبھی اپنے لبوں پر ایسی خاموشی نہیں دیکھی تھی۔

"ایک احساس ہے جس سے میں شعلہ کی طرح جل رہی ہوں میں یادہ وردی میں کھڑی تھی، بیگمات اور شہزادیاں مجھے محبت سے دیکھ رہی تھیں، صوفیا عروسِ نوبیا

ہوا تھا. بادشاہ نے میری پیشانی پر بوسہ دیا، وہ کس قدر ناقابلِ بیان گھڑی تھی، جب وہ پرشکوہ بادشاہ اپنے نوجوانوں کے درمیان بلند حوصلگی اور شوکتِ شاہی کے ساتھ آہستہ آہستہ وادی سے دور، پہاڑوں کے دامنوں میں ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا

"زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ ملک میں فتح و نصرت کی خبریں پھیل گئیں، وقت اپنی یاد کس طرح چھوڑ جاتا ہے، ملک کے بچے اور ان کی مائیں اپنے فاتح سپاہیوں کی راہ دیکھ رہی تھیں، اے بادشاہ وہ مجاہد جنہوں نے تیرے دشمنوں کو شکستیں دی تھیں بوڑھے بادشاہ کی سلامتی اور فتح و نصرت کی آوازیں بلند کرتے ہوئے اپنی روانگی کے وقت سے بھی زیادہ شاندار اور وقار سے واپس آئے. ہم نے انہیں اسی راہ سے آتے دیکھا تھا جس راہ سے وہ رخصت ہوتے تھے۔ اے بادشاہ ضحا کا غیر فانی نام سپاہیوں کی واپسی سے پہلے ہی ملک کے بچے بچے کی زبان پر تھا میں اس وقت کی تصویر نہیں کھینچ سکتی، جب ضحا اپنے بادشاہ کی خوشنودی اور مبارک باد حاصل کر کے فتح مند فوج کا مرکز بن کے واپس آیا. اگر میں اس وقت کی تصویر کھینچنے کی کوشش کروں. تو مجھے ڈر ہے، میں خوشی سے مر جاؤنگی اور تو اس پیغام سے محروم رہ جائیگا. جو میں تجھے اس آڑے وقت میں پہنچانے کے لئے آئی ہوں —— ہاں تو جب فتحمند بادشاہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ طلیطولا کو لوٹا تو فتح و نصرت کی مسرتیں صوفیا کے ایوانوں میں ایک نئی شکل کے ساتھ چل پھر رہی تھیں، اس وقت بادشاہ نے اس تلوار کو جسے تیرے آباؤ اجداد نے حق کے استحکام کی خاطر بار بار جنگوں میں استعمال کیا تھا

تمام رعیت کے سامنے اپنی کمر سے اُتار کر ضحا کی کمر میں باندھ دیا اور کہا —— یہ تیرے لائق ہے اور تو اس کا اہل ہے۔

بادشاہ کی طرف سے وہ نایاب تلوار ضحا کے لئے اس کی شجاعت مردانگی کا تحفہ تھا۔

اے بادشاہ، ایک راز جو میرے اور ضحا کے سینے میں برسوں سے پوشیدہ چلا آتا تھا بادشاہ اس راز سے باخبر تھا۔ اس دن اس نے بھری محفل میں ہمارے راز کو فاش کر دیا۔ اور مجھے ایک نعمت غیر مترقبہ کہہ کر ضحا کو دے ڈالا —— اگرچہ بادشاہ مجھے ایک گھڑی کے لئے بھی اپنے دربار سے جدا نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اے بادشاہ وہ ہماری محبت سے باخبر ہمارے جذبات کے متعلق سب کچھ جانتا تھا محبت خود سر دولت کی طرح اندھی ہوتی ہے اس کی آنکھیں اتھاہ سمندروں سے عمیق فقرا اور شاہوں کی آنکھوں سے بھی روشن تر ہوتی ہیں —— اے بادشاہ میں اور ضحا اس چار دیواری کو اس صحن کو، اس صوفیا کو جس کے اندر میں پھر ایک بار بیٹھی ہوئی نظر آرہی ہوں، ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئے۔

ہم نے اپنے رہنے کے لئے ایک نئی جنت آباد کی، اس جنتِ ارضی میں ہم برسوں رہے ہیں اور راس ہی میں ہم نے اپنی زندگی کے بہترین ایام گذارے ہیں۔

اے بادشاہ وہ تلوار میں آج اپنے ساتھ لائی ہوں اس سرخ لبادہ میں لپٹی ہوئی وہ تلوار ہے جو مرحوم بادشاہ نے ضحا کو اپنی بہترین یادگار کے طور پر دی تھی —— آہ! اس کا مالک! اے بادشاہ اس کا مالک ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا ہے۔ اے بادشاہ اب اسے وہ زندگی حاصل ہو گئی ہے جو کبھی ختم نہ ہو گی، وہ اس جگہ چلا گیا ہے، جہاں سے

وہ کبھی واپس نہ آئیگا۔"

عورت کے آنسو بہہ نکلے، وہ بالکل پگھل گئی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کی طاقت بیان سلب ہو چکی ہے، وہ صرف اتنا کہہ سکی "اے بادشاہ سب اوصاف کھوئے جا چکے ہیں، تمام امیدیں مٹ چکی ہیں، آنکھیں ابھی تک ترستی ہیں، اگرچہ قصہ بہت طویل ہے مگر میں اپنے آپ کو اپنے جذبات کے اظہار کے ناقابل پاتی ہوں —— ہاں یہ ایک امانت ہے، تجھے اس کی ضرورت ہے، تو ہی اس کا وارث اور مالک ہے "میں اسے تیرے حوالے کرتی ہوں"۔

بادشاہ ابن خلدون، ابن حسام کے وارث کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی روشنی چمکتی ہوئی دکھائی دی —— اس کی نظریں بوڑھے سردار کی طرف اُٹھ گئیں، بوڑھے سردار کی آنکھوں میں ایک عنابی آنسو ہچکیاں لے رہا تھا۔ اس نے بڑھاپے کی دانائی اور مسرت کو نمایاں کرتے ہوئے بادشاہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اے بادشاہ وہ میرا بیٹا تھا"۔

خزانہ

جہاں زمین اور آسمان ملتے ہیں ایک بادل کا ٹکڑا شکست خوردہ شاہین کی طرح فضا میں گم ہوتا نظر آرہا تھا۔ یہ ایک ایسی صبح کا ذکر ہے جس میں کیف و کیفیت سوا افسردگی کے کچھ نہ تھا۔ قدرتی نالہ بل کھاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ دو ایک ادھورے جھونپڑے جو گوالوں نے ادھر ادھر ڈال رکھے تھے منظر میں غلط پیوند کی طرح دھندلے دھندلے نظر آتے تھے۔ جوں جوں آفتاب کی روشنی دنیا والوں کے نزدیک آتی جاتی پرندوں کے چہچہانے اور انسانوں کے گنگنانے کی آوازیں لذت آمیز ہوتی جاتیں۔ دودھ دوہنے والیاں اپنے اپنے مویشیوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھیں۔ ایک نے آہستہ سے کہا۔ آخر یہ اندھیر کب تک، دیکھونا آج پھر میری اس گائے کا دودھ چرا لیا گیا ہے۔ یہ حرکت سانپ کی ہے اور سانپ بھی شش ناگ کے

سوا دوسرا نہیں —— اگر یہ سلسلہ کچھ دن یونہی رہا تو مویشی چھوڑ ہمارے بال بچوں کے لئے بھی خطرناک ثابت ہوگا ان موذیوں کی جب یہ عادت ہو گئی ہے تو پھر آدھی رات گئے ایسے ناگوں کا کام سوا اس کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ دوسری بولی —— کہتے ہیں بہت سے ناگ اور ناگنیں انسان کے خصائل رکھتے ہیں۔ وہ مختلف روپ بدل لیتے ہیں اور جب چاہیں پھر سانپ بن جاتے ہیں۔ اتنے میں ایک گوالا بولا۔ "تھوڑا سا لیمپ لانا —— انہوں نے دیکھا کہ تمام گوالے اپنے اپنے جھونپڑوں سے نکل نکل کر کھیت کے کنارے جمع ہوئے ہیں ان قدیم جھونپڑوں کے مالکوں کی حیرت ہر گھڑی بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ جدھر دیکھتے تھے مردہ شی ناگ اور دوسرے زہریلے سانپوں کے کچھ نظر نہ آتا تھا جب وہ ایک کو مٹی کے نیچے دبا چکتے تو ایک اور مردہ سانپ نظر پڑ جاتا۔ بوڑھے گوالے اور گوالنوں نے اس سے پہلے خود دیکھنا تو درکنار اپنے بزرگوں سے بھی اتنے مردہ سانپوں کا تذکرہ نہ سنا تھا اگرچہ بہت سے سپیرے ان میدانوں میں زہریلے سانپوں اور ناگ دیوتا کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہتے تھے اکثر سے ان کی جان پہچان بھی تھی انہوں نے ناگ اور ناگنیوں کی بہت سی کہانیاں بھی انہیں سنائی تھیں مگر کوئی بھی کہانی ایسی نہ تھی جو اس واقعہ سے ملتی جلتی ہو۔ سانپوں سے متعلق جہاں تک انسان کا تعلق ہے کوئی راز اور عقیدہ ایسا ضرور ہے جو ابھی تک پورے طور پر بیان نہیں ہوا اور جو کچھ اس سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے وہ اتنا تھوڑا ہے کہ اس سے انسانوں کی تسلی نہیں ہوتی۔ گو ان قصوں کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں تک پہنچ گئی ہے پر یہ سلسلہ ابھی تک ویسے کا ویسا ہی جاری اور ساری ہے۔

قدرتی نالہ جس کے کنارے ماہی گیروں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے اس سے کچھ دور یہ غیر معمولی واقعہ پیش آیا تھا اور چھوٹے بڑے جس کو دیکھو اس کی زبان پر یہی قصہ تھا۔ ماہی گیر پانی کے کنارے اداس بیٹھے ایک دوسرے کو مایوس نگاہوں سے کچھ اس طرح دیکھ رہے تھے گویا اپنی اپنی عمر کے تجربات کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ایسی ناکام رات انہیں زندگی بھر پیش نہ آئی تھی جس میں چاند کی روشنی اور مطلع بالکل صاف ہو۔ اور پانی اپنی موج میں مچھلیوں کی طرح ایک ہی سمت کا رُخ کئے بہے جا رہا ہو۔ دائیں بائیں جدھر سے بھی ماہی گیر اپنے ڈیرے کو واپس آتے ناکامی اور رنج ان کے چہروں سے ٹپکتا تھا ہر ایک کی زبان پر یہی فقرہ تھا کہ آج کی رات ہم مزدوروں کے لئے عذاب عظیم سے کم نہ تھی۔ کوئی کیا جانے ایک مزدور کو ناکامی کے بعد زندگی کیونکر نظر آتی ہے۔ مزدور اپنے حاصل کے لئے ایک نخیل سے کسی صورت کم نہیں۔ ایک ماہی گیر بولا ناکامی کے آگے تقریباً ہر ایک قوت جواب دے جاتی ہے مجھ سے کوئی پوچھے تو میرے بازؤں میں تو اب جال پھینکنے کی بھی طاقت نہیں رہی اور سچ پوچھو تو میں یہ بھی کہنے کو تیار ہوں کہ جال جو روزی کا ذریعہ ہے مجھ سے گھر تک بھی نہ لے جایا جائیگا۔ ایک اور بولا یہ بیان یقیناً مضحکہ خیز ہے مزدور کی سرشت ہی ایسی ہے اسے اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے ازل سے یہ ورثہ ملا ہے کہ وہ برابر کوشش اور ایک مخلصانہ کوشش کرتا چلا جائے اور کبھی مایوس نہ ہو۔ ایک اور بولا یہ کون کہہ سکتا ہے کہ ابھی کتنی راتیں اس صورت میں گذارنی ہونگی اور کس کس

طرح ناکامیوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ وہ مالک ہی بہتر جانتا ہے کہ گذری ہوئی رات کی ناکامی میں کیا حکمت پوشیدہ تھی۔ جہاں تک اس نالے کا تعلق ہے وہ ہمارے قدموں کی آہٹ سے مسکرانے لگتا ہے مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے ہمارے جسم اس کی مٹی اور پانی کے خمیر سے بنائے گئے ہیں مگر رات کی ناکامی تو برسوں تک یاد رکھنے والی بات ہے۔

ایک بوڑھا ماہی گیر جو چادر اوڑھے زمین پر دراز پڑا تھا کچھ اس انداز سے اُٹھ کر بیٹھ گیا جیسے کسی خواب پریشان نے چونکا کر اسے کھڑا کر دیا ہو۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ ایک دعائیہ رسم ادا کرنے کے طرز سے اپنے منہ پر پھیرے اور اپنے ساتھیوں کو اس انداز سے دیکھا گویا ہر ایک کا جائزہ لے رہا ہے۔ پھر کسی قدر جرأت سے بولا۔ آج تمہیں یقیناً گاؤں کو لوٹ جانا ہوگا۔ بوڑھے کے الفاظ میں گو اس کے اپنے خیال اور بیان کی تائید تھی لیکن اس بات کا اظہار ضرور تھا کہ اس کی رات اپنے ساتھیوں سے بھی زیادہ پریشانی میں گذری ہے۔ اسے یہ نالہ منظر اور اپنے ساتھی کچھ اور سے اور نظر آ رہے تھے۔ ایک نوجوان ماہی گیر نے ذرا گردن اٹھائی اور مایوسی کو دُور کرنے کے خیال سے بوڑھے سے الجھتے ہوئے کہا۔ بڑھاپا بھی کیا عجیب و لطیف شے ہے۔ دوسروں پر بوجھ ڈالنے سے کیا اچھا وقت گذر جاتا ہے۔" دوسرا ماہی گیر بولا۔ بڑے میاں اگر روزی کی تلاش میں میلوں ادھر اور میلوں اُدھر چکر کاٹنے میں رات بسر ہوئی ہوتی اور جال پھینکتے پھینکتے بازو شل

ہو گئے ہوتے تب گاؤں چلنے کی قدر معلوم ہوتی جن کی رات آنکھوں میں کٹی ہو۔
جنہیں رات بھر کوشش کرنے کے باوجود بھی ناکامی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا ہو
اور جنہیں بیوی بچوں کی بھوک پیاس کا احساس ستا رہا ہو ان کا گاؤں چلنا یا
نہ چلنا برابر ہے۔ سال خوردہ ماہی گیر سمجھ گیا کہ یہ لوگ روزی نہ ملنے کے سبب
دل برداشتہ اور مایوس ہو رہے ہیں شاید تمام رات ناکام کوشش میں گذری ہے
اس لئے اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ ایک تمکنت کے ساتھ جو کبھی کبھی بڑھاپے
میں عود کر آتی ہے آبدیدہ ہو کر بولا تم کیا جانو ایک بوڑھے نے اپنی رات کیونکر
بسر کی ہے۔ میرے بچو تم اس بوڑھے ماہی گیر کی زندگی کا اندازہ کیونکر کر سکتے ہو۔
جس نے اپنی تمام عمر موہوم آرزوؤں پر گذاری ہو جس کے سامنے یہی منظر رہا ہو اور
جس نے اکثر اپنے جال کو اس اُمید پر پھینکا ہو کہ آج پانی میں ترنم ہے ہوا خراماں
خراماں چل رہی ہے نیلگوں آسمان اور اَن گنت ستارے سرگوشیاں کرتے دکھائی
دیتے ہیں۔ اس لمحے سمندری شہزادی ضرور اس کے جال میں کھنچی چلی آئیگی اور اس
کی قسمت بدل دیگی وہ کیا سے کیا ہو جائیگا۔ میرے ہم پیشہ نوجوان ماہی گیروں سے
متعلق اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب قصے کہانیاں مشہور ہیں تم نے بھی سُنے
ہونگے۔ تم نے خود بھی ان خوابوں کے لذت افزا لمحوں کا رس چکھا ہو گا کہ موتیوں
سے بھرے ہوتے صدف ملکہ کا گرا ہوا ہار اکثر اوقات ماہی گیر کے جال کی رونق بنے
ہیں۔ سمجھتے ہو ایک ماہی گیر کی زندگی کیا ہے۔ ندی کا کنارہ موہوم امیدیں اس

کا جال اور بس ــــ خواب ہمیشہ دلفریب شے ہیں یوں سمجھو کہ بحر سکوت میں ایک موج مضطرب ہے کبھی سُرخ اور آبِ زر کی طرح رقصاں اور کبھی ارغوانی رنگوں میں ملبوس ہو کر اندھیری راتوں میں آوارہ ! ــــ لیکن ان آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ جیسا کہ تم دیکھتے ہو میں بہت بوڑھا ہوں میرے قوا مضمحل اور جذبات اور حوصلے پست ہو چکے ہیں اور میرے ان خوابوں کی دنیا جن کا میں ذکر کر رہا ہُوں تاریک ہو چکی ہے تم جانتے ہو میں کیا تھا تم کیا ہو اور وہ اُمیدیں جنہیں ہم سنہری امیدیں کہتے ہیں کیونکر بنتی اور بگڑتی ہیں۔

ماہی گیر جو کچھ دیر پہلے بوڑھے کو اپنا روزمرّہ کا ساتھی اور ایک معمولی ساتھی تصور کر رہے تھے اب کچھ اور سمجھنے لگے ان کی نگاہیں حیرت زدہ تھیں بوڑھا اپنی دھن میں کہے جا رہا تھا جیسے خواب کو حقیقت کے لباس میں دیکھا ہے میں چاہتا ہوں کہ رات جو کچھ میں نے دیکھا ہے تم سب کے سامنے من و عن بیان کر دوں کیونکہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے میری تمام عمر کے تجربات اور تصوّرات کے خلاف تھا۔ میں جو کچھ بیان کرنا چاہتا ہُوں شاید تم اسے ایک بھیانک خواب سمجھو مگر یقین جانو یہ حقیقت ہے کیونکہ اس بوڑھے ماہی گیر نے اس طرح دیکھا ہے جس طرح وہ تم کو دیکھ اور مخاطب کر رہا ہے ــــ سب کے سب اسے حیرت سے دیکھنے لگے اس نے کہا عورت اپنی مکاری کے باوجود سادہ لوح بھی بہت ہے خصوصیت سے ایک غریب ماہی گیر اور وہ بھی خوش فہم ماہی گیر کی بیوی۔ ماہی گیر کی بیوی کس قدر سادہ لوح ہوتی ہے۔

کون نہیں جانتا گیا یہ سچ نہیں ہے کہ اس نے جال کی ایک ایک گرہ پر سمندر کی شہزادی کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگی ہیں اس شہزادی کی جو سمندر کے شہنشاہ کی بیٹی اور ملکہ کی آنکھوں کا نور ہے جس کی سلطنت میں موتی مونگے اور زمرد چھوٹے چھوٹے ریزوں کی طرح اِدھر اُدھر لڑھکتے پھرتے ہیں۔

بوڑھے نے اپنی افسردہ زندگی کے متعلق کئی واقعات بیان کیے جن پر ان تمام مزدور پیشہ لوگوں کی زندگی کا انحصار تھا۔ یہاں تک کہ اس کی آواز دوسروں پر چھا گئی۔ غالباً یہ اس کے اندرونی احساس اور کیفیت کا نتیجہ تھا۔ وہ کچھ دیر کے لئے خاموش رہا اس تھوڑے وقفہ کے اندر وہ اپنے ساتھیوں کے خیالات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ ماہی گیروں کو اپنی زندگی دلفریب نظر آنے لگی ہے اور یہی اس کا منشا بھی تھا کیونکہ رات کے واقعات نے خود اس میں غیر معمولی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ بوڑھے نے ایک آہ بھری اور کہا کاش میری جگہ رات کوئی نوجوان ہوتا تاکہ وہ اس حقیقت کو برسوں بیان کرتا رہتا اور کہتا یہ حقیقت ہے اور حقیقت کو کوئی چھپا نہیں سکتا۔ رات جو کچھ میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے وہ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے یوں سمجھو کہ گذشتہ رات کی ایک ایک گھڑی ایک غیر معمولی بات تھی مگر اس بوڑھے ماہی گیر کے سوا اس حقیقت کا کسی کو بھی علم نہیں۔ وہ ذرا اور تن کر بیٹھ گیا۔ اور شانوں کو زندگی کے پُرجوش آثار کی طرح حرکت دے کر بولا آدھی رات گئے جب تم روزی کی تلاش میں میلوں اِدھر اور میلوں اُدھر جا

پچھے تھے میں اونگھ رہا تھا چاند چڑھ چکا تھا یہاں کا ذرّہ ذرّہ تمہاری روزی کے فراخ ہونے کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا یکایک ایسا محسوس ہوا کہ تم لوگ بے وجہ اور بے وقت اپنے ڈیرے کو واپس لوٹ رہے ہو۔ وہ دیکھو اس رتیلے میدان کے اس طرف جو ڈھلوان نظر آ رہا ہے۔ اس نے ڈھلوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے بالکل پیچھے جہاں ایک چھوٹی سی جھاڑی ہے وہاں ایک روشنی جیسے کوئی شمع لیے پھر رہا ہو نظر آ رہی تھی میں نہیں کہہ سکتا کس طرح پہلی ہی نظر میں میں نے اسے ایک عجوبہ خیال کیا اور میری نظر اس کے ساتھ ساتھ گھومنے لگی کیونکہ روشنی بل کھاتی گھومتی چل پھر رہی تھی اگر وہ روشنی مجھے پانی کی سطح پر تیرتی بل کھاتی اور رواں دکھائی دیتی تو میں اسے روزی کے فراخ ہونے کی شہادت سمجھتا لیکن اس کے برعکس یہ روشنی آگ کی طرح لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی اور وہ میرے غور و فکر کا ذریعہ بنتی گئی میں خوف زدہ ہوتا گیا دیکھو نا آخر وہ جگہ دور ہی کتنی ہے جو میں اسے نظر کا دھوکا سمجھتا۔ یہ کہہ کر وہ پھر ذرا تن کر بیٹھ گیا اس کی آنکھوں میں بھی اس وقت ایک روشنی رقصاں تھی جو اس کی عمر اور اس کے تفکرات کا نچوڑ نظر آتی تھی چھوٹے بڑے جس ماہی گیر کو دیکھو بے تابانہ بوڑھے کا منہ تک رہا تھا رات بھر کی کوفت اور تکلیف سب فراموش کر چکے تھے۔ بوڑھے نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا رات کی بات صدیوں کا قصہ معلوم ہوتی ہے کیا بیان کروں ان آنکھوں نے کیا دیکھا ہے خوف اور دہشت کے باعث اس طویل رات کی گھڑیاں برسوں کے دن اور راتیں نظر آ رہی ہیں اگرچہ

نیں بالکل سہا ہوا تھا پھر بھی کوئی بات تھی جو کشاں کشاں مجھے اس طرف لئے جا رہی تھی۔ تم نے بھی سینکڑوں زہریلے سانپوں کی کہانیاں سنی ہونگی اور ان میدانوں میں اور نالے کے کنارے بڑے بڑے شی ناگ دیکھے ہونگے مگر رات کے واقعات نے تو میرے اوسان خطا کر دیئے تھے ہر طرف ایسی چنگاریاں اڑتی نظر آتی تھیں جیسے لوہے کو تپا کر کوٹا جا رہا ہو۔ روشنی کے ساتھ ساتھ گرمی بڑھتی جاتی تھی اور میرے سامنے ایک لامتناہی منظر پھیلا ہوا تھا۔ غیظ و غضب کا ایک آتشیں دریا تھا جو امڈا چلا آ رہا تھا اور یہ جگہ جو اس وقت نظر آ رہی ہے ایک مہیب اور دہشت ناک رزمگاہ بنی ہوئی تھی جدھر دیکھو شی ناگ اور زہریلے سانپوں کے کچھ نظر نہ آتا تھا آہ کس قدر غیر معمولی واقعہ تھا جو رات کی رات میں اس دھرتی پر گذرا ہے "سچ کہتا ہوں" رات کی بات صدیوں کی بات معلوم ہوتی ہے"۔۔۔ وہ لنڈ منڈ درخت جس پر تمام دن گدھ اونگھتے رہتے ہیں رات کو ایک خوفناک بھوت کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا۔ میں اپنی عمر کا بہترین حصہ گذار چکا ہوں مجھے اس بات کا احساس اکثر جرأت دلاتا رہتا ہے اور میں اس جرأت کے سبب کئی غیر معمولی کام انجام دے لیتا ہوں چنانچہ میں اس وقت بھی جی کڑا کر کے اُٹھا اور یہ جذبہ لے کر اس طرف چل دیا کہ موت سے بڑھ کر اور کس سے دو چار ہو سکتا ہوں۔ نظارے نے اس قدر طول کھینچا کہ میں بغیر کچھ سوچے سمجھے وہاں تک پہنچ گیا اب میں کیونکر بیان کروں کہ اس تمام کشمکش کے بعد میں نے کیا دیکھا اور انسانی آنکھ سے اس دھرتی پر ابھی تک کیا کچھ اوجھل ہے کوئی نہیں جانتا رات کے واقعات

نے تو میرا نظریہ ہی بدل دیا ہے۔ قدیم تہذیب اور روایات کے پابند لوگ وہ اعلان زر جذبات میں ڈوبے ہوئے لوگ اپنے تھے انہیں اس قسم کے واقعات۔ عاملوں فقیروں اور سنیاسیوں کے ذریعہ ہی معلوم ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک پرانے زمانے کے قصے اور کہانیاں ختم نہیں ہوئیں اور جب کبھی کوئی ایسا واقع پیش آجاتا ہے تو اس کی تائید میں ایسی ایسی روح افزا حکایتیں بیان کی جاتی ہیں جو قدیم زمانے سے روایات کے طور پر زندہ ہیں۔ مگر میرے ہم پیشہ بچو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ رات کا واقعہ کئے کو تو مختلف قسم کے سانپوں کا ایک مجمع تھا لیکن اتنی تعداد میں اور اتنی قسم کے اس سے پہلے سانپ کسی انسانی آنکھ نے مشکل ہی سے دیکھے ہوں اور کسی کان نے سُنے ہوں بہر حال میں تمہیں اس قدر بتانا چاہتا ہوں تاکہ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور میں اپنی باطنی کشمکش سے آزادی حاصل کر سکوں۔ ان سانپوں میں سے بعض کی شکلیں تو اس قدر ہیبت ناک تھیں کہ ان کا تصور بھی موت بن کر آتا ہے لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں جسے سانپوں سے متعلق ایسی اہمیت دی جائے کیونکہ وہ ہمیشہ سے خوفناک ہیں۔ ان میں بعض اس قدر خوبصورت اور دلاویز تھے کہ راجکماریوں اور خوبصورت داسیوں کی طرح عقیدت کے جذبے سے جھومتے دکھائی دیتے تھے۔ بعض اس قدر معصوم تھے کہ انہیں گود میں کھلانے کو دل چاہتا تھا۔ بعض شہزادیوں کی طرح سبک رفتار بھی تھے جن کا جسم کنول کے پتے کی چکناہٹ سے چکنا اور لچکدار تھا جس طرف نظر اٹھاؤ آنکھیں ہی آنکھیں گھوم رہی تھیں بالکل ایسا نظر آتا تھا

گویا دھوپ کی تیزی میں ریت کے ذرے جھلملا رہے ہیں بعض کا رنگ اس قدر سرخ تھا جیسے کسی حبشی عورت نے گلے میں لعل و یاقوت کا ہار ڈال رکھا ہو ان میں جو سیاہ تھے محض دیکھنے کے لئے سیاہ تھے ورنہ اُن کا بدن مچھلی سے بھی زیادہ چکنا اور چمکدار جو سفید تھے وہ بالکل ابلق گھوڑوں کی مانند نظر میں کھبتے جاتے تھے جو نیلے سیاہی مائل تھے یقین جانو آسمان نے بھی تاروں بھری رات میں کبھی ایسا دلفریب رنگ نہ پایا ہوگا ان میں بعض سبز بھی تھے جو زمرد کی طرح سرد اور کسی صوفی کی قبا کی طرح پُراسرار دکھائی دیتے تھے افعی اور شی ناگوں کا یہ تمام مجمع محفل رقص بنا ہوا تھا جو آگ میں کھیلی جا رہی تھی ہر طرف زہر کے پھوارے چھوٹ رہے تھے پھر ہر طرف پھنکارے مارتی ہوئی روشنی میں روشنی دکھائی دینے لگی یہ ناگ دیوتا کے آنے کی تیاریاں تھیں۔ ناگ دیوتا ایک ایسے سانپ کے پھن پر سوار تھا جس کی شکل چوپاؤں کی سی تھی۔ پھر سب ایک منظم فوج کی طرح قطار در قطار حلقے بنائے اس میدان میں پھیل گئے گویا کوئی تہوار تھا جس کے منانے کی تیاریاں برسوں کے بعد تکمیل کو پہنچی تھیں مجمع یقیناً پُرامن تھا اور اس کا مقصد محض ناگ دیوتا کو بلند کرنا اور اس خوف اور حکومت کا اظہار کرنا تھا جو ان کو دنیا پر حاصل ہے ——— پھر یکایک بہت دور ایک شور سنائی دیا جو اس میدان کی طرف آندھی کی طرح بڑھتا چلا آ رہا تھا قریب آنے پر معلوم ہوا کہ وہ باغی سانپوں کا گروہ تھا کیونکہ انہوں نے وہاں پہنچتے ہی ناگ دیوتا اور اس کے ہمراہیوں پر پے در پے حملے شروع کر دیئے تھے۔ دونوں گروہ ایک دوسرے پر زہر اور آگ اُگلنے میں مصروف

تھے۔ کس طرح کیونکہ کل رات دھرتی پر کیا ہوا تھا اور اس پیر مرد کی آنکھ نے کیا دیکھا تھا پھر ایک بوڑھے کمزور ناتواں نے اس خونی واقعات کو کس طرح برداشت کیا تھا۔ کوئی کیا جان سکتا ہے۔ یہ آتش اور زہر کی جنگ بہت دیر تک جاری رہی اس میں ناگ دیوتا بہت بُری طرح زخمی ہوا تھا اور اسے ہزاروں قربانیوں کے بعد موت کے پنجے سے چھڑایا گیا تھا وہ اپنے محافظوں کی مدد سے بچا تھا اور ان کی مدد ہی سے واپس لوٹا تھا اس کے ساتھی جو باقی بچے تھے میں کہ نہیں سکتا کدھر سے آئے اور کدھر گئے تھے لیکن تم میرے بیان کی تصدیق اس میدان میں جا کر سکتے ہو جہاں قسم قسم کے ہزاروں سانپ مرے پڑے ہیں میری طرف اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہ دیکھو میرا بیان یہاں ختم نہیں ہو جاتا۔ اصل واقعہ جو بہت اہمیت رکھتا ہے مجھے ابھی بیان کرنا ہے۔ رات ڈیوڑھی سے زیادہ ختم ہو گئی تھی اور چاند پچھم کی جانب سفر کرتے کرتے نیچے اُتر گیا تھا میں اس واقعہ سے اس قدر خوف زدہ تھا کہ یہاں تک پہنچنے کی طاقت بھی نہ رہی تھی کہ اتنے میں میرے کانوں میں ایک آواز آئی جیسے کوئی انسان موت کے ساتھ جنگ کر رہا ہو اور مدد کے لئے پکار رہا ہو۔ اس خوفناک واقعہ کے بیان سے جس طرح تم خوف زدہ ہو گئے ہو اور تمہارے منہ کھُلے کے کھُلے رہ گئے ہیں یہی حالت مجھ پر طاری تھی اور میں اِدھر اُدھر سہارا تلاش کر رہا تھا۔ رات کی بات اگرچہ صدیوں کا قصہ معلوم ہوتی ہے مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جو کچھ ہوا وہ بالکل صحیح تھا اور تمہارے اس بوڑھے ساتھی نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے تم اندازہ کر

سکتے ہو کہ میرے اور موت کے درمیان کس قدر فاصلہ رہ گیا ہو گا۔ میں نے دوبارہ پھر وہی آواز سنی اور اپنے آپ سے کہا تو عمر کی ہر منزل سے گذر چکا ہے تجھے ضرور اس آواز پر لبیک کہنی چاہیئے۔ میرے بچو میرے ہم پیشہ بھائیو پھر میں اس جگہ کے درمیان جہاں زہر اور آگ کے سوا کچھ نہ تھا بڑھا میں جس دھن میں بڑھے جا رہا تھا وہ انسانی ہمدردی سے متعلق بھی مجھے اندیشہ تھا کہ اس ہنگامہ زار میں ہم میں سے کوئی نہ کوئی کچلا گیا ہے اور اسے فی الواقع میری مدد کی ضرورت ہے اور میں اس کے کام آ سکتا ہوں لیکن تم حیران ہو گے یہ سب وہم تھا کیونکہ دراصل وہ ایک سانپ تھا جو میری اور تمہاری طرح کراہ رہا تھا۔ وہ درد محسوس کر رہا تھا۔ وہ بار بار انتقام کی آگ سے مشتعل ہو کر اُٹھتا اکڑتا بل کھاتا اور زخموں کے باعث پھر زمین پر گر جاتا تھا۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو اس طرح معلوم ہوا کہ اس کی آنکھوں میں ایک امید زندگی کی طرح کروٹیں لینے لگی ہے وہ مجھے ایک انسان کی طرح مخاطب کرتے ہوئے بولا میرے ہم جنس میرے پاس آ مجھے اس وقت تیری ضرورت تھی کیونکہ تیرے سوا خالق کی مخلوق میں کوئی ہستی نہیں جسے دنیا کی ہر ایک قوت پر قدرت حاصل ہو تو مرد میدان ہے تو دنیا کا فاتح اور خدا کا نائب ہے تجھے میرے جسم میں سے اپنے خون کی بُو آئیگی آ میرے نزدیک آ۔ تمہیں ایک راز بتانا ہے۔ تمہیں ایک پیغام پہنچانا ہے۔ سانپ ہزاروں روپ بدل لیتا ہے یہاں تک کہ وہ انسان بن جائے مگر وہ مجھ سے خائف ضرور رہیگا۔ یہ جنگ یہ زہر آلود اور خوفناک جنگ جو آج رات اس دھرتی کے سینے پر واقع ہوئی ہے۔ ناگ دیوتا کے

کے خلاف بغی ——— اس جنگ اور بغاوت کا بانی بن ہوں۔ میں چاہتا تھا۔
ناگ دیوتا کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے بن کبھی ناگ دیوتا کا نائب رہ چکا ہوں تم
جانتے ہو انسانوں میں بھی شیطان صفت انسان ہوتے ہیں اور سانپوں اور ناگوں
کی طرح ایک دوسرے کو ڈستے پھرتے ہیں مجھے ناگ دیوتا کے تمام منتر اور خزانوں کا
علم ہے مجھے اس سے نفرت ہے بن نے برسوں کی کوشش اور تدبر سے سانپوں
بن اس کے خلاف بغاوت اور نفرت کا جذبہ پیدا کیا تھا اور ایک شاندار گروہ بنایا تھا
کہ اس دھرتی سے اس کا نام و نشان مٹا دیا جائے مگر کم ظرفوں نے اپنی کم ظرفی کے
سبب مجھے اس حال کو پہنچا دیا ہے۔ سن اے دانشمند سن میں مر رہا ہوں یہ میری آخری
گھڑیاں ہیں میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ ہم دونوں بھائی بھائی ہیں اس لئے بن جو تم
سے کہونگا وہ بالکل سچ ہوگا۔ میرے مرنے کے بعد میرے جسم کو مٹی میں دفن کر دینا کیونکہ
سانپ کو مٹی کے نیچے دبانے کی رسم قدیم سے ہے اس میں بھی ایک راز پوشیدہ ہے بہر حال
تم ضرور ایسا کرنا جیسا کہ بن نے تم سے التجا کے طور پر کہا ہے۔ اس کے بعد جب پورب
کی طرف ساری دھرتی پر سرخ سرخ بادل چھا جائیں اور بجلیاں کوندنے لگیں اور
آسمان سے پانی کی بجائے خون برسنے لگے اور ہوائیں طوفان کی طرح ادھر سے
اُدھر دھرتی کا ناش کر دینے میں مصروف ہوں تو وادی کوراں سے دور بہت دور
نکل جانا وہاں تمہیں ایک بستی ملے گی جس کا نام بستی دیبہ ہے تم وہاں کے رہنے والوں
کی حالت بہت خراب پاؤ گے ان بن اکثر اندھے اپاہج ہونگے اور بہت سے ایسے

بہرے بھی ہونگے کہ کسی آواز کو بھی نہیں سُن سکتے وہ تم سے بیان کرینگے کہ ہم سانپ
کھا لیتے ہیں۔ ہم سانپ بن جاتے ہیں ہم انکے منتر جانتے ہیں ہمارے پاس ناگ دیوتا کا من موجود ہے
اور ہر زہریلے سے زہریلے سانپ پر ہمیں قدرت حاصل ہے مگر تم دیکھو گے کہ ان
کی حالت بہت خراب وخستہ اور قابل رحم ہے۔ تم یہی سمجھنا کہ وہ اس لاف زنی کے
سوا کچھ نہیں جانتے کیونکہ انہیں سانپوں کی دولت اور خزانوں کا کچھ علم نہیں۔ ہاں
ایک آدمی وہاں ایسا بھی رہتا ہے جسے وہ پاگل بیوقوف اور خدا جانے کیا کیا کچھ کہتے
ہیں۔ وہ ایک اونچے ٹیلے پر بڑے بڑے پتھروں کے درمیان سکونت پذیر ہے جو آفتاب
کی روشنی میں صاف شفاف شیشے کی مانند نظر آتے ہیں اس کی عمر سانپوں کی عمر
سمجھو جو خود نہیں بتا سکتا کہ اس کی عمر کتنی ہے۔ جب تم اس کو ملوگے تو وہ تمہارے سامنے
آنکھ بھی نہ اٹھا سکے گا۔ اس سے کہنا کہ سی نیلم شکست کھا کر مر گیا ہے پھر اس کے
بعد میری یہ نشانی دکھا دینا اور کہنا یہ اس کا پیغام ہے اگر کوئی انتقام کی صورت ہے
تو میں حاضر ہوں۔ میری موت کی خبر سُن کر اس کے آنسو بہہ نکلیں گے یاد رکھو اگر وہ اپنی
حالت پر قابو نہ پاسکا تو وہ زمین پر گر پڑیگا۔ اس وقت یہ سُرخ موتی جو میں نے تمہیں
دیا ہے اور اس پر ناگ دیوتا کی زندگی اور موت کا انحصار ہے اس کے پھڑکتے
ہوئے لبوں پر رکھ دینا۔ یہ کہہ کر سی نیلم کا سانس رُک گیا اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔
اپنی شکست کے غم میں بل کھاتے اور تڑپتے تڑپتے اس نے اپنے آپ کو
میرے قدموں پر ڈال دیا پھر بہت دیر کے بعد جیسے ہچکیاں لیتے لیتے کسی کا سانس

رک جائے صرف اتنا کہنا اس کا اور میرا باپ بیٹے کا رشتہ ہے۔ اس کی آنکھوں تلے
اندھیرا آجائیگا اس کی بصارت زائل ہو جائیگی اس کی آرزوؤں پر پانی پھر جائیگا کیونکہ
جو کچھ وہ سنے گا اپنی تمام اُمیدوں کے خلاف سُنے گا ممکن ہے وہ اس صدمہ سے
جانبر نہ ہو سکے پر تم اس سے ضرور یہ کہہ دینا کہ ہم ناگ دیوتا کا خاتمہ کر دینگے ہم تیرے
پاس انسانوں کی ایک شاندار اور منظم جمعیت لے کر آئیں گے تاکہ سی بلیم کا انتقام
لیا جاسکے۔ اس گھڑی اگر وہ مسکرا دے اور اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہوں
تو تم بے خوف و خطر اس کے لبوں پر اپنے لب رکھ دینا ایسا کرنے سے تمہارے
دل و دماغ میں ایک روشنی سما جائیگی جس سے تمہیں تمام پوشیدہ چیزوں کے دیکھنے
پر قدرت حاصل ہو جائیگی۔ یہاں تک کہ ان تمام خزانوں کو بھی دیکھ سکوگے جو انسانی
نگاہ سے آج تک پوشیدہ ہیں اور ان ناگوں کو بھی دیکھ سکوگے جنہوں نے انسان
جیسی لازوال قوت کو بھی خائف کر رکھا ہے۔ موت سے کوئی نہیں بچ سکتا وہ میرے
باپ کی موت کا دن ہو گا جیسے خود اپنی عمر کا علم نہیں اگر وہ آنکھیں بالکل بند کر لے اور
بے حس و حرکت ہو جائے تو سمجھ لینا کہ وہ ختم ہو چکا ہے اسے میری موت نے دنیا کی
ہر چیز سے ناامید کر دیا ہے اور اس کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ انسانوں کو اس
عذاب سے بچا سکے جس کے سبب جنت میں انقلاب واقع ہوا تھا۔ اس کے خاتمہ
پر تمہیں پوشیدہ چیزوں کے دیکھنے پر قدرت حاصل ہو چکی ہو گی تم ان خزانوں پر قبضہ
کر لینا جن کے نہ ملنے سے تم محتاج بن کر مارے مارے پھر رہے ہو اور شیطان کی

غلامی میں اپنی عزیز عمریں ختم کرنے پر مجبور ہو چکے ہو ۔

میرے بچو تمہاری کھلی کھلی آنکھوں اور حیرت زدہ چہروں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم ابھی تک میرے بیان کو ایک کہانی اور قصہ سمجھ رہے ہو لیکن یہ دیکھو یسی شلیم کا مردہ جسم اور اس کا دیا ہوا سُرخ موتی جو اس نے مجھے دیا تھا اور میں نے تمہیں دکھانے کی غرض سے رکھ چھوڑا ہے میرے پاس موجود ہے ۔

کیا میں نہ کہتا تھا کہ رات کی بات صدیوں کا قصہ معلوم ہوتی ہے اور اس بڈھے نے جو کچھ دیکھا وہ حقیقت پر مبنی ہے ۔

اوتار

۱

وہ تن تنہا درختوں والا صحرا، راہبوں کی دنیا، رہبانیت کا سبب یہی کچھ تھا اور یہی کچھ نظر آتا تھا۔ وہاں دیکھنے کو کچھ تھا، تو وہ محض ایک ندّی، وہ بھی فطرت کی دیا۔ یہ من موہنی صحرا کے وسط سے سرد آہیں بھرتی، ٹھنڈا جل لئے، جس طرح من بھاتا بہتی بہے جا رہی تھی، جب چرواہے پاس کی بستیوں سے ادھر آ نکلتے، اور اونچے اونچے ٹیلوں سے اسے بہتا ہوا دیکھتے، تو اپنے راگوں میں گاتے، ندی دھرتی پر ایک آشلیہ ہے جو ایشور نے اپنی تپسیا کی دھن میں دیوتاؤں سے بھی زیادہ سندر بنائی ہے اور دھرتی پر کہکشاں کی پرچھائیں بنا کر پھیلا رکھی ہے —— دھیان کرو تو یہی نظر آتا۔ صدیوں سے اس میں کوئی انقلاب اور کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی یہاں تک کہ وہ اب بھی اپنے مستقبل کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ اس کے دو کنارے اور اس کا صاف شفاف

پانی ان دشت نشینوں کی دولت اور زندگی کا سہارا تھا جنہوں نے اس کے قرب وجوار میں اپنا مسکن بنایا تھا۔ ندی کا شفاف پانی اور ویران کنارے قدیم عقیدے اور راہبوں کی مرضی کے مظہر تھے۔ جہاں قدرت نے ریاضت اور رہبانیت کے لئے ضرورت سے زیادہ سامان مہیا کر رکھا تھا۔ یہاں کے رہنے والے عبادت گزار عورتوں کے سایہ تک سے ڈرتے تھے، اور انہیں اپنے عقیدے اور عبادت کا تاریک پہلو تصوّر کرتے تھے۔ خوبصورتی کا انہیں بھی ذوق تھا۔ مگر یہ فطرت کے نقاد موت کی سی دلگداز لذتوں میں زندگی کی دیکھ بھال کرتے، یہی ان کی عبادت تھی اور یہی جستجو!

اس حسرت بھرے ویرانے میں سبزہ بہت کم اور ریت اس کثرت سے موجود تھی، کہ جس طرف نظر اٹھاؤ، ریت کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ باوجود ان سادہ نظاروں کے فضا میں ایک خاص ترنم اور سکون پایا جاتا تھا۔ ماہی گیر بھی اکثر اس طرف آتے تھے، اور فطرت کی اس دیا کو اپنی روزی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کے بوسیدہ جال اور مختصر سے ڈیرے اِدھر اُدھر پڑے پائے جاتے تھے، ہرنوں اور چکاروں کے گروہ دن رات ان تپتے ہوئے میدانوں میں گشت لگاتے اور اس ویرانے کی زینت سمجھے جاتے، وہ پہروں ندی کے کنارے گردنیں جھکاتے بنانے والے کے گُن گاتے نظر آتے تھے۔ ندی کے اس پار سے درندوں کی ہیبت ناک آوازیں بھی اکثر آتی رہتی تھیں، کبھی کبھی لنڈ منڈ درختوں سے گدھ کی مکروہ چیخ و پکار بھی سنائی دے جاتی تھی۔ مگر سیاہ ٹہنیوں کے ہلنے کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس سارے منظر کی یاد تلازہ

دیکھنے کو اگر کسی مصوّر کا جذبۂ دل چاہتا تو وہ اپنے رنگوں اور خطوں میں ایک جھونپڑے ایک آدھ درخت اور مستانہ خرام جوئے آب کے سوا اور کچھ نہ دکھا سکتا جو ہر ایک نگاہ کا قدرتی مرکز تھی، یہ منظر صحرا کی وسعتوں سے تھکی ہوئی نظروں کے لئے بہت بڑا سہارا تھا۔ یہی ایک جھونپڑا تھا جس پر اس سارے ویرانے کی نگاہیں اٹھتی تھیں اور یہی انسانوں کے اس طرف آنکلنے کا ذریعہ بنا ہوا تھا سوہ گوالے اور چرواہے جوان جنگلوں اور میدانوں کے مالک اور رازدار سمجھے جاتے تھے، جانتے تھے اور کہتے تھے کہ اسی جھونپڑے پر ہماری روحانی قوتوں کا دارومدار ہے۔ ہمارے لئے گویا اس کا دیکھ لینا ہی گونہ تسکین کا باعث ہے۔ جھونپڑا ایک بہت بڑے مندر کی حیثیت رکھتا تھا۔ بعض تو اسے بڑے بڑے تیکدوں سے بھی برتر اور ایک بڑا تیرتھ سمجھتے تھے، یہ جھونپڑا ندی کے بہت پیچھے ہٹ کر واقع ہوا تھا۔ یہ بے ستونوں کا گھر اس چٹیل میدان میں عنادیدِ قدیم کا نمونہ معلوم ہوتا تھا جس کے ٹوٹے ہوئے ستون گھاس پھونس کے بغیر اور کچھ نہ تھے، یہ کھوکھلا پہاڑ ہموار زمین پر تنہا ہونے کا فریادی تھا جس کی راہ غار دل کی طرح منہ کھولے، ہڈیوں کا ڈھانچہ، اور پرانے پتھر نظر آتے تھے۔ جھونپڑا کیا تھا کھوکھلی ہڈیوں کا انبار تھا، اور عقابوں کے آشیانوں سے بہت کچھ مشابہ تھا جس کا مکین ایک بوڑھا راہب اور ایک چاند سی دوشیزہ تھی، ان دونوں کے سوا کسی کو بہت کم اس جھونپڑے میں آتے جاتے دیکھا گیا ہوگا۔ جھونپڑے کے علاوہ ندی کے کنارے ایک مختصر چار اینٹوں کا فرش تھا، جو اس بوڑھے راہب کی بھگتی کی جگہ اور تسکین کا

سہارا تھا اور وہی اس کی شب و روز کی نشست تھی، جو اسی جھونپڑے کا مالک یا مہمان تھا۔ راہب اس چھوٹی سی نشست پر دن رات اپنے دیوتاؤں اور معبودوں کی یاد میں مالا جپتا رہتا تھا۔ یہی جگہ تھی، جہاں یہ گیانی سادھو دھیان لگاتے، آنکھ نہ جھپکنے اور خاموش بُت بنے رہنے کی مشق کیا کرتا تھا اور کبھی کبھی مستانہ وار اس طرح جھومتا نظر آتا، جیسے پانی کی سطح پر اسے کچھ دکھائی دے رہا ہے۔ مندروں اور تنکدوں میں جانے سے اسے ضد تھی۔ وہاں جانے کا خیال اس کے دل میں کبھی نہ آیا تھا۔ نہ اس خیال نے اسے کبھی تنگ کیا، اور نہ کبھی کسی نے اس کو اِدھر اُدھر آتے جاتے دیکھا تھا۔

بوڑھے راہب کی شخصیت اپنے طرز کی مثال آپ تھی، لوگوں کو اس پر کئی قسم کے شبہات تھے، بعض کا تو یہ گمان تھا کہ یہ بوڑھا کوئی نیا مذہب اختراع کرے گا۔ اس لیے پرانے خیال کے بندے بدھ مت کے دلدادہ اسے بدگمانی اور نفرت سے دیکھا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا جھونپڑا سوائے اس دوشیزہ کے غیر آباد چلا آتا تھا لیکن دوسری طرف یہ بھی صحیح ہے کہ جو اس کے جاننے والے تھے، وہ اس کے آگے عقیدت اور احترام سے جھک جاتے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ وہ ان کی تاریک زندگی کو اپنی تپسیا کے بل پر بدل دیگا۔ وہ نہ تو اس کی بھگتی کے رنگ ڈھنگ کو غیر نگاہوں سے دیکھتے اور نہ کبھی اس سے اس پر شکوہ بت کدے کے چھوڑنے کی شکایت کرتے، جسے ان کے آباد اجداد نے اپنے خون پسینے اور دولت سے آباد کیا تھا۔ ہاں انہیں اپنی اپنی ذہنیت کے مطابق یہ خیال ضرور تنگ کیا کرتا تھا کہ وہ کیوں اپنے پرانے ساتھیوں

اور گذری ہوئی صحبتوں کا ذکر نہیں کرتا، مگر یہ بوڑھے راہب کی روحانی قوت کا کمال تھا، کہ انہیں اس قسم کے خیالات کے اظہار کی جرآت نہ ہوتی تھی، اس قسم کے ہزاروں خیال اور وہم اس کے موافق و مخالف سرگوشیوں کی شکل میں موجود تھے، بدھ مذہب کا سب سے پرانا مندر جہاں اشوکا کے اقوال اور بدھ کی برگزیدگی کے کئی اشلوک کندہ تھے جس کا ذرہ ذرہ مقدس اور محترم خیال کیا جاتا تھا جھونپڑے سے کچھ دور، دنیا کی ہاؤ ہو سے الگ تھلگ کھنڈر کا کھنڈر سسک رہا تھا۔ وہاں نہ وہ پہلی سی رونق تھی اور نہ وہ روحانی صحبتیں، نہ پجاریوں کی پوجا، نہ جاتریوں کی آمد و رفت! کچھ تھا تو یہی کہ کھنڈروں کے درمیان بدھ کی مورت، شاہ بلوط کے درختوں سے زیادہ بلند، راجوں اور مہاراجوں کے محلوں سے زیادہ پرشکوہ، اپنی ہستی کا ثبوت دینے کے لئے کھڑی تھی جس کے گندھے ہوئے بالوں کے نیچے روشنیوں کے حلقے اور کنول کا مکٹ ظاہر کیا گیا تھا۔ ہاتھوں کی انگلیوں سے اب تک کچھ سمجھاتا ہوا، اور لبوں سے ابھی تک کچھ کہتا ہوا معلوم ہوتا تھا جہاں پرانی تہذیب ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی، وہ جگہ جہاں کبھی سر جھکتے تھے، اور دل پانی پانی ہو کر بہہ جاتے تھے اب اس کی ان تھک خاموشی دیوتاؤں اور معبودوں کے گلے کا ہار ہو رہی تھی، یہ سرمایۂ تاریخ، یہ یادگار سلف عقدہ کشائی اور خضر راہ بننے کے ڈر سے خودکشی کر چکی تھی بڑے بڑے بت جو بڑے بڑے ماہرین فن کی تراش اور کاوش کا نتیجہ تھے، صدیوں سے آسن جمائے، خاموشی کے عالم میں بت بنے بیٹھے تھے، گویا بنانے والے نے ہمیشہ کے لئے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ غرض مندر کا مندر

اپنے عقائد و اعمال کی سزا اور قدیم روایات ان معبودوں اور دیوتاؤں کا باربن کر رہ گیا ہے۔ اور یہ سب انسانوں کے ہاتھوں سے تراشی ہوئی پریم او تار شکلیں دبتی اور نیچے ہی نیچے اترتی جارہی ہیں —— یہ مخمور شکلیں، وہ لمبی لمبی نکیلی، نیم باز آنکھیں، اور وہ خم دار انگلیاں کچھ اس طرح سے اٹھی ہوئی تھیں، کہ جب دیکھو یہ معلوم ہوتا کچھ کہہ رہی ہیں۔ پاؤں ہیں کہ کنول کی طرح کھلتے اور بند ہوتے نظر آرہے ہیں۔ یہ بنانے والوں کی عقیدت اور ریاضت کا نتیجہ تھا جو انہوں نے اپنے فن کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے انجام دی تھیں بعض لمبے لمبے کوہ قامت بت، یونانیوں کی طرح ایک ریمی سی چادر میں لپٹے ہوئے تھے، اور بعض بالکل عریاں تھے، جو جیون چکر، سنسار اور کل جگ کو ظاہر کر رہے تھے، وہ جگہ جہاں دن رات دھوپ، اگر کی بتیاں، اور شمعدان جگمگاتے رہتے تھے صبح و شام کے قہر و غضب کا نقشہ بن گئی تھی، گیدڑ اور شبر اور چیتے، ان غاروں اور کھنڈروں سے نکل کر چیخیں مارنے لگتے تھے، یہ سب کچھ تھا مگر بڈھا راہب ان باتوں پر کبھی دھیان نہ دیتا تھا۔ بدھ کے بھولے بھالے۔ سادہ لوح پجاری، اپنے اپنے عقیدوں کے مطابق دیوتاؤں کی تخلیق کے گیت گارہے ہیں اور وقت کے پھیر میں چکر کاٹ رہے ہیں، غریب راہب ان مشکلات کا شکار بننے اور ایسے گورکھ دھندوں میں الجھنے سے بہت پرہیز کرتا تھا، جس کی وہ مذہبی دیوانے اس بوڑھے راہب سے توقع رکھتے تھے اور اسے محض اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھے ہوئے تھے، مگر راہب جسے صدیوں کا تلخ تجربہ تھا، الٹی باتوں کو جو اس کے عقیدے اور مقصد سے صدیوں پیچھے رہ گئی تھیں، کب خاطر میں

لاتا تھا۔ لوگوں کو راہب سے بجا شکایت ہو مندر کی عظمت، راہب کے خیالوں سے کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، مگر وہ اپنی بے سمجھی پر نازاں تھا، ان جذبات اور کیفیات سے قطعی بے بہرہ ہو چکا تھا جس پر اس کے بھائی بند جانیں قربان کر رہے تھے، وہ کچی اینٹوں کے اس مختصر سے فرش پر بیٹھا، اپنی مالا جپتا رہتا۔ یہی اس کی روحانی خوشی اور زندگی تھی

اس کی آرزوئیں، زندگی یا موت، سب کچھ اسی ویرانے سے وابستہ تھی۔ وہ دنوں، مہینوں برابر عبادت میں مشغول رہتا، مگر باوجود عبادت کی اس جفاکشی کے جب دیکھو عمر میں تازہ دم نظر آتا تھا۔ وہ عبادت کے بعد سیدھا جھونپڑے کی طرف آتا، اور پہروں خاموش بُت بنا اس روحانی سرور کو جو اسے عبادت سے حاصل ہو گیا تھا سمجھنے اور سوچنے میں صرف کیا کرتا۔ اس کی معصوم لڑکی شانتا نہایت سنجیدہ اور ذی فہم لڑکی تھی۔ قدرت نے اسے زندہ رہنے کی عقل دے رکھی تھی۔ اس کا دل آرزوئے حیات سے معمور تھا جس پر بوڑھے راہب کی شفقت اور خلوص نے بہت گہرا اثر ڈالا تھا کیونکہ بوڑھے کی زندگی کا ایک مقصد تھا کہ وہ اسکے وقار کو بلند کرے ۔ لڑکی بوڑھے کے مقصد کو خوب سمجھ گئی تھی، وہ جانتی تھی اس کے پتا کی آرزوئیں ایک پیغام مقدس ہے، ورنہ راہب کی ان تھک عبادتوں کی مصروفیت میں ایسی پاکیزہ پرورش ناممکن تھی۔

اس کا یقین تھا۔ کہ راہب اپنی شانتا کو ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں بھول سکتا۔ لیکن جب وہ ماہی گیر سے مل کر پہروں بیٹھا اس کا منہ تکتا رہتا ہے اور عبادت جیسی نعمت کو بھی بھول جاتا ہے، تو اپنی شانتا کی دیکھ بھال کیوں نہیں کرتا۔ باوجود ان باتوں کے وہ ان تمام واقعات سے جن سے اسے رنج پہنچا تھا چشم پوشی کرنے پر آمادہ ہو گئی

تھی، اور اپنے گیانی پتا کی ہر خدمت کو بجالانا اپنا فرض سمجھتی تھی، وہ ماہی گیر جو راہب کا دوست اور اپنے پرانے وقتوں کا ساتھی اور مہربان تھا، شانتا کی ان تمام خوبیوں کا قائل تھا، اور اس کی سعادتمندانہ خدمات کی وجہ سے اس کی ہر طرح سے دلجوئی کرتا اور اسے نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔

ندی برسات کے دنوں میں یقیناً خوشنما دکھائی دیتی تھی، اس کا حُسن اور عادتیں بھولی بھالی شانتا سے ملتی جلتی تھیں، شانتا کے دیکھنے سے خود آرائی اور خود بینی کا احساس کبھی پیدا نہ ہوتا تھا۔ بلکہ اس کے اندر ہی اندر کوئی ایسی قوت پرورش پا رہی تھی، جو ان جذبات سے کہیں بلند تصوّر پیش کرتی تھی، یہی وجہ تھی کہ اس کی ظاہرا بناوٹ سے بھی یہ کیفیت پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی، ماہی گیر اس کے اس وصف سے غافل نہ تھا، بوڑھا راہب اکثر لوگوں کی نظروں میں بہت خشک تھا، مگر ماہی گیر ایک ایسی ہستی تھی، جسے دیکھتے ہی بے خود ہو جاتا تھا۔ شانتا بھی ماہی گیر کی راہب سے کچھ کم عزت نہ کرتی تھی اور اسے اپنے بُرے بھلے وقت کا سہارا بھی جانتی تھی ——— ماہی گیر کو دیکھتے ہی اس کی کشادہ پیشانی خوشی سے تمتما اٹھتی تھی۔ جہاں اس کے نیلگوں بال جٹاؤں کی طرح بل کھاتے ادھر اُدھر جھومتے رہتے تھے، ماہی گیر نے بارہا شانتا کو بغل میں لے کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا ہوگا۔ وہ عقیدت سے یقیناً تھرتھرانے لگی ہوگی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہونگے، یہ سب اس عالمگیر محبت کے نشانات تھے جو راہب اور ماہی گیر کے درمیان فطرتاً تکمیل پا رہی تھی، ویرانہ حُسن سے شاداب اور پُر فضا بنا ہوا تھا ——— ماہی گیر اور

راہب ندی کے کنارے پریم کے وجدان میں بیٹھے بیٹھے دن سے رات اور رات سے دن کر دیتے تھے!

ماہی گیر اور راہب کی صحبتیں آہستہ آہستہ قابل رشک بن گئیں تھیں اس دفعہ غیر معمولی طور پر ماہی گیر کو راہب کی خدمت میں کئی روز گذر گئے، شانتا اور ماہی گیر کا لڑکا باہوز انہیں اس عالم میں دیکھ کر کچھ نہ سمجھ سکے۔ شانتا اتنا ضرور جانتی تھی۔ کہ اس کے مالک اور پتا کی حالت میں کوئی انقلاب واقع ہو رہا ہے۔ وہ ایک نادان دوشیزہ اور سیدھی سادھی لڑکی تھی ——— ایک صبح ابھی پو بھی نہ پھٹی تھی کہ راہب کا سر ماہی گیر کے زانو پر تھا اور ماہی گیر کا رحمت بھرا ہاتھ راہب کے سینے پر' اس طرح وہ تسکین اور بخشش کا سمندر منجمد ہو کر رہ گیا' موت آئی اور ایک خاموش نغمے کی مانند' ندی کے پار سمندروں سے دور راہب کو لے کر چلتی بنی' ماہی گیر اس کی آخری گھڑیوں کا ساتھی اور اس کا رازدار بنا' اس نے شانتا کے سر پر ہاتھ رکھا۔ آج تک لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ماہی گیر نے راہب کو سفید چادر میں لپیٹ کر ندی کے سپرد کر دیا تھا۔ شانتا راہب کی موت پر بدعت کچھ چاہتی تھی' مگر ماہی گیر نے شانتا کے کہنے کی کوئی پروا نہ کی اور جو اس کے دل میں آیا کیا ——— اب اس اجاڑ بستی میں شانتا کے سوا دوسرا کوئی نہ تھا' گو اس نے راہب کی زندگی میں اس سے فیضان ضرور حاصل کیا تھا' مگر آخر کار وہ ایک لڑکی تھی' بہت پژمردہ سی ——— ماہی گیر اک جہاں دیدہ اور بردبار انسان واقع ہوا تھا۔ وہ شانتا کی خبرگیری کرنے اور راہب کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے ہر گھڑی ندی کے کنارے پڑا رہتا تھا۔

شانتا اس کا دلی احترام کرتی اور اسے راہب کی جگہ اپنا مالک اور پتا سمجھتی، اور اپنی ہر ایک آرزو اور خواہش کو اس سے بیان کرتے ہوئے ذرا نہ جھجکتی۔ راہب کی موت کے بعد ماہی گیر ہر گھڑی اداس رہتا تھا۔ ندی اسے سونی سونی دکھائی دیتی تھی۔ اگر اس کی لڈا کے لئے باہو سا نوجوان اور فرمانبردار بیٹا نہ ہوتا تو ضرور تھا کہ اس کی بھی موت آج سے کئی روز پہلے واقع ہو گئی ہوتی ——— شانتا اور باہو اس کی باقی ماندہ زندگی کا سہارا تھے ماہی گیر باہو پر بھی شانتا کی طرح نازاں اور مہربان تھا۔ کیونکہ دونوں کے اطوار اور عادات بہت ملتے جلتے تھے۔

باہو کو ندی کے کنارے آئے بہت دن گذر گئے تھے۔ وہ اداس سا معلوم ہوتا تھا۔ اسے شہر کے بازار، گلیاں اور رونق بہت بھاتی تھیں، شانتا کو مایوس دیکھ کر اس کے دل میں کئی قسم کے احساسات پیدا ہوتے اور مٹ جاتے۔ کبھی کبھی فضا میں اسے اپنے جذبات مسرور اور موجیں مارتے ہوئے نظر آتے اور ندی اس کے اپنے خیالوں کی رو میں بہتی ہوئی خوش خوش نظر آتی۔ آہستہ آہستہ اسے شہر کی رونق کے بغیر یہاں بھی ایک دلبستگی محسوس ہونے لگی۔ ماہی گیر کی تعلیم سے وہ کسی طرح دور نہ تھا۔ شانتا بھی اسے اب غیر مانوس نظر نہ آتی تھی۔ ماہی گیر جس طرح عبادت کے فریضے میں کبھی کوتاہی نہ کرتا تھا یہی حال اس کی محنت اور مشقت کا تھا۔ بڑا دیانت دار، جب دیکھو روزی کے لئے پوری طرح جد و جہد کر رہا ہے اکثر اپنا جال اٹھائے دور نکل جاتا، اور شانتا اور باہو شام کے دھندلکے میں راہب کی اس پرانی نشست پر اس کے انتظار میں، ندی کی ان تھک اور ابدی رفتار پر نظریں

گاڑھے بُت بننے انتظار کرتے —— اسی طرح جینے اور سال گذر گئے، شانتا کے دل کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔ یہ سب راہب کے عقیدے کی پختگی کا نتیجہ تھا۔

اندھیری اور چاندنی رات اپنے اندر کیا فرق رکھتی ہے، شانتا یہ ابھی تک محسوس نہ کرتی تھی، گو وہ پہلے کی نسبت زیادہ خوش تھی اور اپنی دیکھ بھال زیادہ کرتی تھی —— اب ویرانے میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں اسے بے گانگی نظر آئے، وہ خوشی اور بےفکری جو راہب کی موت سے یکایک گم ہو گئی تھی، پھر فضا میں اسے پر تولتی ہوئی نظر آئی —

وہ ندی کے کنارے بیٹھی تھی۔ اس نے پہلی دفعہ محسوس کیا، ایک چاند ہے، کائنات پر اس کی روشنی نور کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ ہوا ہے، اور وہ کھیل رہی ہے، پھر یکایک اسے باہو کی کمی کا احساس ہوا، کون کہہ سکتا ہے، وقت کونسا رنگ اختیار کریگا ندی کیا کیا روپ بدلے گی، اور وہ ریاضتیں جو ماہی گیر اور راہب نے ندی کے کنارے کی ہیں، کس طرح غیر فانی زندگی حاصل کر لیں گی؟ شانتا اس طرح بیٹھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ کہ اس کے سینے کے اندر ایک تشنگی محسوس ہوئی، وہ یقیناً اس طرح نظر آ رہی تھی، گویا دنیا کی کوئی چیز اسے بے کیف نظر نہیں آئی، شانتا اپنے عقیدے کی وجہ سے باہو ماہی گیر سے کبھی آزردہ خاطر نہ ہوتی —— وہ محض اپنے معبودوں کی ترجمان نہ تھی۔ بلکہ اسے اپنے جذبات کی ترجمانی زیادہ منظور تھی۔

وہ ماہی گیر کو دیکھ کر تعظیماً کھڑی ہو جاتی۔ سر سے اُترا ہوا کپڑا فوراً اوڑھ لیتی، ہاتھ جوڑ کر سر جھکانا اپنا فرض سمجھتی اور اسے یہ سب کچھ بہت زیب دیتا تھا۔ وہ اتنی سادہ

اور روح پرور لڑکی تھی، کہ اسے دیکھ کر ماہی گیر کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگتے اور راہب کی یاد میں اس کا رقیق قلب گداز ہو جاتا۔ شانتا اس سے چمٹ جاتی، اس کے اس برتاؤ سے ماہی گیر کی رہی سہی قوت بھی مفقود ہو جاتی اور وہ کچھ کہنے سننے سے بھی عاجز ہو جاتا۔

شانتا نے ایک روز خیال کیا، باہو کس قدر خشک ہے، وہ اپنے پتا سے بالکل مختلف ہے، وہ مجھے کیوں بغل میں نہیں دبالیتا، وہ کیوں اپنا ہاتھ میرے سر پر نہیں رکھ دیتا، پھر اس نے اپنے آپ کو ملامت کی، کہ میں خود کس قدر خشک ہوں میں خود اس سے کیوں چمٹ نہیں جاتی، وہ تو بہت اچھا، بڑے خوبصورت دل والا باہو ہے۔ شانتا اب ان ہنگیریوں اور خوشیوں کے سبب تپسیا کرنے میں زیادہ سرور پاتی تھی۔ اس کی پیشانی کی رتی چمک رہی تھی، ماہی گیر راہب کی موت کے بعد شانتا کو بدھ کے پرانے مندر میں لے گیا تھا، کیونکہ یہ اس کی دیرینہ تمنا تھی، شانتا ابھی اپنی شباب جوانی کے جوش اور امنگوں سے ناواقف تھی، وہ دیوانی دیوتاؤں کے پریم اور مندر دیکھنے کی دھن میں سب کچھ لٹا چکی تھی، جسے وہ شانتی اور زندگی کا حاصل سمجھ رہی تھی، اس کے دل کے تلاطم اور روح کی بیداری کو سلا دینے کے لئے کافی اور اس کی نشوونما پانے والی زندگی کا رہزن تھا۔ اور اس کے اصلی جوہروں کے لئے گھن کی طرح تھا۔

ماہی گیر کے بغیر اور اس کی آواز سنے بغیر، جس سے اسے تسکین ملتی تھی، وہ بے چین

رہتی تھی، لیکن باہو کے لئے اس نے کبھی ایسا محسوس نہ کیا تھا، اسے اپنے اطمینان قلب کے لئے ماہی گیر کا جس قدر خیال رہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں باہو نے اس کے جذبات میں کوئی جگہ حاصل نہ کی تھی، اگرچہ وہ نسوانی فطرت کے تقاضے سے مجبور باہو کو ماہی گیر سے مختلف ضرور پاتی تھی! باہو اور ماہی گیر، دونوں ایک روز بستی کی طرف گئے، اسے ایسا معلوم ہوا، برس گذر گئے ہیں، اور نہیں آئے ——— وہ کیوں نہیں آتے، میں اپنی ریاضت میں خامیاں پاتی ہوں، میں تصور جماتی ہوں اور مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ مجھے ماہی گیر سے ابھی بہت کچھ حاصل کرنا ہے، وہ ندی کی طرف جا رہی تھی اور اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے ندی دور چلی گئی ہے۔ وقت میں کچھ تبدیلی محسوس ہوئی، پھر اسے ماہی گیر کے قدموں کی آہٹ سنائی دی، وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھتی رہی، مگر اسے کچھ نظر نہ آیا یکایک اس نے محسوس کیا کہ وہ سینے میں تھی، اور وہ ختم ہو گیا ہے ——— اس کی آنکھوں میں بے وجہ آنسو بھر آئے اس نے کچھ سہارا چاہا، مگر ایک سانس تک بھی سنائی نہ دیتا تھا۔ پھر اس نے گھبراتے ہوئے کانپتے ہوئے چاروں طرف دیکھا اور اپنے آپ کو ازل کی تنہائی سے ہم کنار پایا اس کا چہرہ جس پر رونق آتے ابھی کچھ ہی دن ہوتے تھے، دھندلا اور پیلا پڑ گیا اور اس نے کہا یقیناً میری تمام خوشیاں اور آرزوئیں کسی وسیع تر اور نامعلوم دنیا کی طرف گم ہوتی جا رہی ہیں، اس نے معصومیت کے انداز سے اپنی آنکھیں بند کیں اور بار بار کھولیں، مگر کچھ نہ پایا، اور وہ انتہائی کے احساس میں غرق ہو گئی۔ وہ تنہائی جسے وہ تو جید

کا منظر سمجھے ہوئے تھی، بالکل نہ سمجھی تھی، اس کے دل کے اندر گہرائیوں میں اسے کچھ سنائی دیتا تھا، مگر وہ اسے سمجھ نہ سکتی تھی!

ماہی گیر نہ آئیگا میں مرجاؤنگی، آہ بوڑھے راہب کی ریاضتوں نے اس کی انجان شانتا کی کوئی مدد نہیں کی، وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی، خوشی کے مارے اس کے لب کھل گئے، اس نے دیکھا اور ایک کشتی بہت تیزی کے ساتھ اس کی طرف چلی آرہی ہے وہ اسے اپنی ریاضتوں اور عبادتوں کا ثمر سمجھی، اور دیوتاؤں کی دنیا میں جانے کا تصور باندھنے لگی —— وہ اس کشتی کی آمد پر اپنی موت اور حیات منحصر سمجھی، مگر یہ سراب بہت جلد مٹ گیا، اس کی تمام خوشیوں اور امیدوں پر پانی پھر گیا، یہ بے وقت آنے والا باہو تھا، جسے شانتا اوتاروں اور معبودوں کی دیا سمجھ رہی تھی —— باہو آیا، اس نے کچھ کہا، دونوں کے دل بجھے ہوئے تھے، وہ کشتی میں سوار ہوئے اور چل دیئے —— یہ راج ہنسوں کا جوڑا ندی کی سطح پر اڑا چلا جا رہا تھا، فضا کا سہانا منظر ان کی آنکھوں میں کھنچا چلا آرہا تھا، یقیناً ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں —— یہ پہلی رات تھی کہ شانتا اپنے پرانے جھونپڑے سے باہر رہی اور اس نے باہو کے دوش بدوش سفر کیا۔

اس واقعے کو بہت دن گذر گئے، اب جھونپڑے کے سامنے باہو اور شانتا اداس اداس اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اور آپس میں باتیں کرتے دکھائی دیتے تھے جیسے غزالوں کا جوڑا —— راہب اور ماہی گیر، دونوں ان کی نظروں سے اوجھل

ہو چکے تھے اور وہ ایسی دنیا میں رہتے تھے، جسے انہوں نے دیکھا تھا نہ پایا تھا۔ وہ اس
اَن دیکھی دنیا کے خواب دیکھا کرتے تھے، جہاں ان کے پالنے اور چاہنے والے
ان کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

باہو اور شانتا دونوں آزاد تھے، مگر انہیں اپنی آزادی کا غم تھا۔ اگر وہ پابندِ
رسوم تھے، تو اس سے نادم تھے، نہ انہیں ریاضت میں کیف ملتا تھا اور نہ باتوں میں
لطف آتا تھا۔ ہر ایک چیز بیگانہ تھی،

شانتا کہتی تھی، دنیا نے روپ بدل لیا ہے، پریم اور تپسیا کے سارے کام
دیوتاؤں کی خوشبوؤں سے، اور ان کی آشا سے بدلتے جاتے ہیں۔ باہو
راہب اور ماہی گیر نے تو ہمیں کچھ نہیں بخشا، دیکھو یہ دنیا کس قدر اندھیری ہے۔
ہماری منزل اور اس کی منزل میں بڑا فرق ہے، میں کس مندر کی پجارن ہوں اور
مجھے کیا کرنا ہے، میں کچھ نہیں جانتی —— وہ بے بس ہو کر اس فرش پر گر گئی۔ جہاں
بوڑھے راہب نے برسوں ریاضت اور تپسیا کرتے کرتے جان دے دی تھی، عقل
کے وہ نکتے جن کو حل کرنے سے عقل بھی چکراتی ہے، پریم اور پریم کے نغمے پتھروں میں
دل اور دلوں میں جان ڈال دیتے ہیں، عقل میں اتنی صلاحیت ہی کہاں کہ وہ پتھروں
کو تراش کر بُت بنا دے، عقل کا جوشِ عمل اپنا بُت بنا سکتا ہے مگر وہ دنیا کو تخلیق نہیں
کر سکتا۔"

انہیں ایک نئی دنیا ملی تھی، جس کی تخلیق کے وہ خود مالک تھے۔ محبت ہاتھوں

میں مشعلیں لئے برہنہ کھڑی تھی۔

شانتا سچ کہتی تھی، وہ یہ نہیں جانتی اسے کیا کرنا ہے۔ باہو بستیوں میں رہنے والا تھا اسے دنیا میں رہ کر جد وجہد کا سبق دیا گیا تھا، اُسے غلامی اور آزادی کا فرق معلوم تھا، وہ شانتا کے جذبات اور اس کی قدر کرتا تھا، اسے علم تھا کہ ایک لڑکی کی آرزوؤں کو دکھ دینا باہو کا کام نہیں —— اسے ماہی گیر کے الفاظ یاد تھے۔ وہ اس بوجھ کے اٹھانے کے قابل نہیں جس سے عمر اور وقت نے اسے دوچار کر دیا ہے"!

شانتا اور باہو بہت سی الجھنوں اور غفلتوں کے باوجود کبھی کبھی بدھ کے پرانے مندر کو جایا کرتے تھے۔ باہو اس سلسلے میں اس کا خضر راہ تھا، وہ اس کے ہر جذبے کی قدر کرتا تھا، چاہے اسے شانتا کی آرزوؤں سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو جب کبھی وہ اس بت کدے کے درمیان جگر کا ٹتے نظر آتے، تو ایسا معلوم ہوتا، پانی کی سطح پر دو کنول تیرتے پھرتے ہیں —— وہ بڑے بڑے بت جو اس بت کدے میں استعادہ تھے، اگر ان کے سینوں میں خون کا ایک قطرہ بھی ہوتا، تو وہ اس بے غرض جوڑے پر ضرور بھینٹ چڑھا دیتے، یہ سیر گاہ شانتا کی اندرونی کشمکش کا بہت کچھ سہارا تھی جس کی حقیقت سے وہ نا آشنا تھی۔ اگرچہ اسے یہ معلوم ہو چکا تھا، کہ وہ اب راہب کے کرم خوردہ جھونپڑے میں رہنے کے قابل نہیں رہی، اور اسے اس بات کا بھی احساس تھا۔ کہ باہو کو ان اُجڑے ہوئے مندروں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی —— اور یہاں کی فضا اسے بالکل نہیں بھاتی، شانتا مندروں کی دیواروں پر باہو کے ہاتھوں اور

کندھوں کے سہارے چڑھا کرتی تھی، ایسی اور بھی چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں جن سے وہ زندہ اور شاداب نظر آ رہی تھی۔

باہو جو چاہتا کرتا، شانتا کا من جس طرح بہلتا بہلاتی، دونوں کی خوشی اور دونوں کا مقصد حیات یہی رہ گیا تھا، آج کی شام برسوں کے انتظار کے بعد آئی تھی، ندی اور جھونپڑا، ان کی تمناؤں سے دُور، اور ان کے جذبات کا آئینہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اگرچہ انھوں نے ایک دوسرے کو بتایا نہ تھا، لیکن وہ جانتے تھے کہ وہ اب اس کی طرف کبھی نہ لوٹیں گے، جہاں ان کی دلبستگی کا کوئی سامان نہیں رہا۔ جن منظروں اور وجدانوں میں شانتا بے خود تھی، ان کا لطف شانتا ہی جانتی تھی، اور زندگی کے تخیل کی پرواز، جس میں باہو اڑا جا رہا تھا، اس کا باہو ہی کو علم تھا، شانتا خود نظارہ بن گئی تھی، باہو اسے فضائے عالم میں اک نشاط روح تصور کر رہا تھا، اور وہ کسی طرح بھی ایک دوسرے سے بیگانہ اور بے خبر نہ تھے، وہ جو کچھ تھے، وہ خود تھے! سارا منظر قبرستان کی طرح خاموش لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ ان سے روزمرہ کے پامال راستے پر اب چلا بھی نہ جاتا تھا جھونپڑا اب ان کی دنیا نہ تھی!

شام کا وقت تھا، شفق دلہن بنی ہوئی مشرق کی طرف قدم بڑھا رہی تھی، اس کے پاؤں پازیبوں سے خالی تھے، اس کے اندر تکلم موسیقی موجود نہ تھی۔ باہو خلافِ معمول بڑے بڑے استادہ پتھروں کے درمیان جو اٹل پہاڑوں کی طرح کھڑے تھے۔ مندر کے شکستہ دروازہ میں کھڑا یہ آخری نظارہ دیکھ رہا تھا۔ ادھر شانتا محوِ تماشا تھی کہ وہ آج

رات جی بھر کر مندر کا نظارہ کرے گی، جس کا خواب وہ مدتوں سے دیکھا کرتی تھی۔

سایہ بالکل ڈھل چکا تھا۔ اندھیرا ہی اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ شانتا اس سحر کے فریب میں خود بت بن چکی تھی، باہو جو اُوپر کے حصے میں کھڑا تھا، اس کا سایہ شانتا پر پڑ رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شانتا نے اپنے آپ کو باہو کے سائے میں کانپتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس شدت سے کانپ رہی تھی کہ مندر کا تمام منظر کانپنے لگا۔ یہاں تک کہ اسے ساری کائنات کانپتی ہوئی دکھائی دی، باہو کے سایہ نے اس رات شانتا کو کچھ اور کا اور ہی بنا دیا تھا۔

مندر سرشام خوفناک صورت اختیار کر گیا تھا۔ بڑے بڑے بتوں کے سائے، زخمی اژدہوں کی طرح کروٹیں بدلتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، سینکڑوں مجسمے منہ کے بل گرے ہوئے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہے تھے، شیروں کی دھاڑ اور گیدڑوں کی آوازیں اس دہشت کو اور بھی بڑھا رہی تھیں —— آہ! اس تکدہ کو کس نے بنایا ہوگا۔ کتنے عقیدت بھرے دلوں نے اس کا طواف کیا ہوگا جس کی یاد آج تک دلوں کو تڑپا رہی ہے۔ بتوں کے ٹوٹ جانے اور ان کے بازوؤں کے ناکارہ ہونے کا غم کسے نہ ہوگا، جو فن کا کمال اور دولت کا بہترین مصرف تھا، کون کہہ سکتا تھا، اوتاروں اور معبودوں کے یہ تمام نقوش محض صنعت اور تراش کی مثال بن جائیں گے —— دنیا ان مجسموں کو فقط سنگ تراشی کا کمال سمجھے گی اور یہ ان کے پرستاروں کے لئے ان کی تہذیب کا نقش بن کر باقی رہ جائیں گے

ان کے سنگ تراشوں کو کیا معلوم تھا کہ یہ پہاڑ، یہ پتھر، جن کو ہم اپنے جذبات کا مجسمہ بنا رہے ہیں، پھر اس خاک کا ڈھیر بن جائیں گے اور یہ ان کی لمبی لمبی کنول کی سی آنکھیں اور وضع دار انگلیاں جن کو دیکھنے سے ہیجان پیدا ہوتا ہے کچھ روک تھام نہ کر سکیں گی۔ یہ چاندی سونے اور جواہرات کا انبار اک بارگراں بن جائے گا۔ اور یہ پھولوں کی مالا جو کسی راج رانی نے اپنی منت کے لئے چڑھائی تھی، اس طرح سے کملا جائے گی —— باہو نے دبی آواز میں کہا۔ "شانتا" اس کی آواز میں دیوتاؤں جیسا رس اور اوتاروں کا سا جلال پایا جاتا تھا۔ شانتا چپ رہی وہ یقیناً چاہتی تھی کہ باہو اس کا نام بار بار لیتا رہے، اور وہ سنتی چلی جائے۔ اس نے کہا۔ اگر میں سکتہ کے عالم میں کھڑی کھڑی مر جاؤں تو یہ اُجڑی ہوئی جگہ اور اجاڑ ہو جائے گی، باہو کو یقیناً میرا غم ہوگا، اور یہاں سے رات کبھی اپنا نقاب نہ اٹھائے گی —— شانتا کھڑے رہنے کے ناقابل ہو چکی تھی۔

باہو نے کہا۔ شانتا آ، دیوتا۔ تجھ سے روٹھ گئے ہیں، ان کے بازو تیرے لئے نہیں کھلتے، باولی تیرے خواب سب خواب ہیں۔ دیا، دیوتاؤں کی دیا بھی دھرتی کی طرف نہیں پلٹتی، دیوتاؤں کے کار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کبھی دھرتی انہیں بھاتی ہے، اور جب چاہیں وہ دھرتی کا ناش کر دیتے ہیں"۔ شانتا خاموش بت بنی سب کچھ سنتی رہی، اس نے گردن جھکالی، جیسے پھول بوجھ کے مارے جھک گیا ہو۔ اس کا رواں رواں اظہار تمنا بن رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی، کہ باہو اسے پھولوں کی

کی طرح چوم لے، وہ چاہتی تھی، باہو کی اندرونی خوبصورتیوں کو ایک ایک کر کے گن ڈالے، جن کا اس پر گہرا اثر تھا۔

اس نے کہا۔ "ہاں دیوتا۔ دیوتا ہیں، انہیں تجھے اور تیری شان کو ممتاز بنانا ہے۔"

باہو نے وہ شعلے جو ہڈیوں سے اُٹھ رہے تھے۔ ان ہڈیوں سے جو شانتا کے بزرگوں نے اپنے اپنے عقیدے کے مطابق، دیوتاؤں کے سامنے ڈھیر کر رکھی تھی۔ درہم برہم کر دیئے، جنہیں شانتا، نورگ کی تجلیاں، شانتی کی ضیا پاشیاں، اور خدا جانے کیا کیا سمجھ رہی تھی ——— شانتا اب وہ پہلی سی شانتا نہ رہی تھی۔ اس کا نظریہ بدل چکا تھا۔ بولی "باہو، میں نہیں سمجھی۔ میں اپنے یقین اور عقیدے کے دوسرے سرے پر کس طرح پہنچی، اور میں نے کس طرح دیوتاؤں کی مجموعی طاقت کا مظہر تم کو سمجھ لیا ——— باہو دیوتا! تم دیوتا ہو ——— آؤ، میں تمہیں پیار کرنا چاہتی ہوں! باہو، دیکھو تم نے شانتا کو بدل دیا ہے۔ شانتا معصوم، یتیم، بالکل نادان تو نے اسے تنہا پا کر لوٹ لیا ہے۔

شانتا کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اس کا گیان، یقین، عمل سب کچھ بد اعتقادی کی وجہ سے پاش پاش ہو رہا تھا۔ اس کے دھیان میں باہو نے ایک نیا قالب بدل لیا تھا ——— وہ دیکھتی رہی، دیوتاؤں اور اوتاروں کی شکتی، باہو کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے اور وہ ان سب مقدس شکلوں کا واحد مجسمہ دیوتاؤں

کی طرح دھرتی کے سینے پر کیسا خاموش، اونچا ہی اونچا اُبھرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے
وہ ایک سمندر تھا، جو شانتا کے سینے کے اندر موجیں مار رہا تھا۔
وہ ایک نغمہ تھا، جو شانتا کے روئیں روئیں سے پھوٹ کر نکل رہا تھا۔
شانتا نے آنکھوں کو روشن پاتے ہوئے کہا۔ "باہو تم کیوں چپ ہو، تم کس قدر قریب ہو، وہ دیکھو تمہارے خم دار بکھرے ہوئے بالوں کے پیچھے چندرماں گھوم رہا ہے، وہ تمہاری پیشانی کی تجلیاں کرنوں کی طرح دُور دُور تک پھیل گئی ہیں"۔
شانتا نے سمجھ لیا تھا۔ وہ باہو کے نورانی جسم کے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔
"باہو۔ باہو میری آنکھوں میں تیرے نور نے چکا چوند پھیلا دی ہے" باہو بولو تمہاری شانتا کی زبان بند ہوتی جاتی ہے۔ دیکھو اس کی آنکھوں سے دیکھو وہ کیا دیکھ رہی ہے۔
سحر ٹوٹ چکا تھا۔ شانتا کی زبان میں لکنت آ چکی تھی، اس کے نزدیک باہو سے بڑا کوئی دیوتا نہ تھا۔ اور وہ اس کی ادنیٰ پجارن بن چکی تھی مندر اس صبح بقعہ نور بنا ہوا تھا، تجلیاں مسکرا رہی تھیں۔
فضا میں جذبات ہی جذبات امڈتے دکھائی دے رہے تھے، چرواہے، چراگاہوں اور آس پاس کے کھیتوں سے دیوانہ وار بھاگے آ رہے تھے ان کا بیان ہے کہ راہب کی بیٹی شانتا اور باہو، دونوں مندر کے اندر بت بنے پائے گئے تھے۔ بعض کہتے تھے، کہ جس طرح وہ مرے ہوئے پائے گئے تھے اسی طرح، اس

وقت کے سنگ تراشوں نے ان کا بُت تراش لیا تھا ـــــــ یہ مختلف رائیں ایک ہی خیال کی تائید میں تھیں، مجسمہ آج تک موجود ہے، اور اس پرانے مندر میں دلگداز کو دینے والی ایک ہی صورت رہ گئی ہے، جس کا انجام ابدیت ہے اور کچھ نہیں" !